ماہنامہ

قومی ڈائجسٹ

لاہور

دسمبر 2021

ممتاز صحافی قدرت اللہ چودھری مرحوم
کی یاد میں خصوصی گوشہ

ملٹری کالج جہلم کی یادیں
میرے لیے سرمایہ حیات ہیں

ڈاکٹر اجمل نیازی نے میرا مضمون پڑھ کر
مجھے ایڈیٹر کالج میگزین مقرر کر دیا

میرے تنقیدی کالم پر نوابزادہ نصر اللہ خاں
نے احتجاج کیا تو مجھے اخبار سے فارغ کر دیا گیا

ممتاز ادیب اور صحافی ڈاکٹر یوسف عالمگیرین
کی روداد حیات ان کی اپنی زبانی

قومی ڈائجسٹ
دسمبر 2021
قیمت 100 روپے

Scanned with CamScanner

روزنامہ پاکستان

قوم کے ہر فرد کی آواز

ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاہور

دسمبر 2021 ◉ جلد 43 ◉ شمارہ 12

چیف ایڈیٹر
مجیب الرحمٰن شامی

ایڈیٹر
عثمان شامی

مینجنگ ایڈیٹر
علی شامی

سینئر ایڈیٹر
خالد ہمایوں

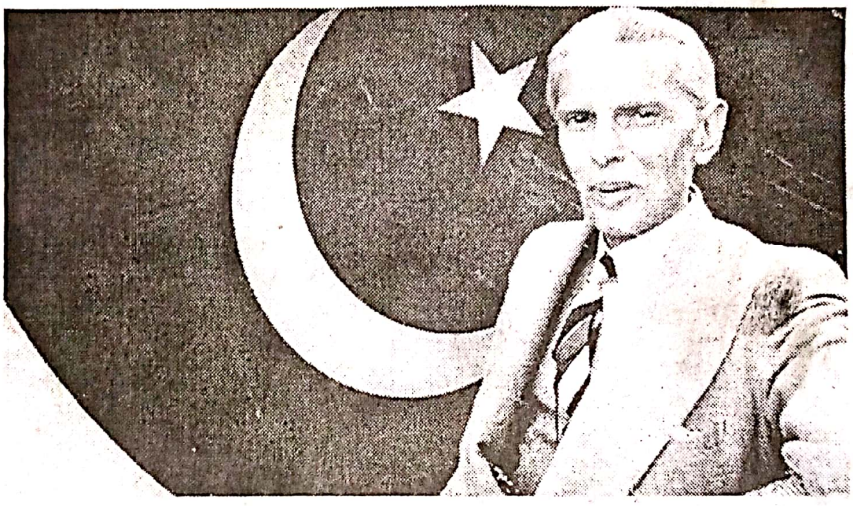

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ

تاریخ پیدائش: 25 دسمبر 1876ء

...ست: پاکستان: 100 روپے۔ سالانہ چندہ: بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک: 1440 روپے، بذریعہ عام ڈاک 1000 روپے ۔ متحدہ عرب امارات: 11 درہم ۔ سعودی عرب: 11 سعودی ریال
...ون ملک بدل اشتراک: سعودی عرب، یو اے ای، بحرین، قطر، تھائی لینڈ، چین، جاپان، کوریا، ہانگ کانگ، سنگاپور، مالدیپ، ڈنمارک، ناروے، فرانس، سویڈن، ہالینڈ، بلجیم،
...ان، جرمنی، برطانیہ 4000 روپے انڈونیشیا، ملائیشیا، نائجیریا، جنوبی افریقہ، بھارت، لیبیا، سوڈان، بنگلہ دیش 4000 روپے، آسٹریلیا، کینیڈا، امریکہ 4500 روپے

...وکتابت کا پتہ: دفتر ماہنامہ قومی ڈائجسٹ 41 جیل روڈ لاہور، فون: 042-35404061-65

فیکس: 042-35404066-67

Email

qaumidigestpak@gmail.com

مجیب الرحمٰن شامی پرنٹر پبلشر نے قومی پریس سے چھپوا کر 41 جیل روڈ لاہور سے شائع کیا

Scanned with CamScanner

اس شمارے میں

یادداشتیں
ڈاکٹر یوسف عالمگیرین
مرتب: عبدالستار اعوان 6

اداریہ
بیرونی قرضے اور عوام کی تشویش 5 خالد ہمایوں

عالم طیور
پرندوں کی کائنات
ڈاکٹر وقار علی گل 69

کہانیاں
شوق کی تکمیل
تنویر صادق 140
کمرہ
آصف علی 155

خصوصی گوشہ
قدرت اللہ چودھری مرحوم
- اہل قلم کا خراج عقیدت 91
- اعزہ واقارب کی یادیں 127
- احباب کے تاثرات 135

انٹرویو
سقوطِ ڈھاکہ 16 دسمبر 1971ء 73 سید علمدار رضا

شخصیت
ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ 85 ڈاکٹر شہزاد خان

سلسلہ وار ناول
گوندنی والا تکیہ (قسط نمبر:2) 167 غلام عباس

یادِ ماضی
مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا 143 ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی

تبصرہ کتب
مرتب: خالد ہمایوں 179

شعروادب
جمہوریت کے نام پر (نظم) 90 مجید لاہوری

فلاحِ انسانیت
امریکہ میں مقیم درددل رکھنے والے پاکستانی 149 محمد فاروق چوہان

Scanned with CamScanner

اس شمارے میں

یادداشتیں

ڈاکٹر یوسف عالمگیرین
مرتب: عبدالستار اعوان 6

اداریہ
بیرونی قرضے اور عوام کی تشویش 5 خالد ہمایوں

عالم طیور
پرندوں کی کائنات
ڈاکٹر وقار علی گل ــــــ 69

کہانیاں
شوق کی تکمیل
تنویر صادق 140
کمرہ
آصف علی 155

خصوصی گوشہ
قدرت اللہ چودھری مرحوم
- اہل قلم کا خراج عقیدت 91
- اعزہ و اقارب کی یادیں 127
- احباب کے تاثرات 135

انٹرویو
سقوطِ ڈھاکہ 16 دسمبر 1971ء 73 سید علمدار رضا

شخصیت
ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ 85 ڈاکٹر شہزاد خان

سلسلہ وار ناول
گوندنی والا تکیہ (قسط نمبر:2) 167 غلام عباس

یادِ ماضی
مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا 143 ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی

تبصرہ کتب
مرتب: خالد ہمایوں 179

شعر و ادب
جمہوریت کے نام پر (نظم) 90 مجید لاہوری

فلاحِ انسانیت
امریکہ میں مقیم دردِ دل رکھنے والے پاکستانی 149 محمد فاروق چوہان

ڈاکٹر یوسف عالمگیرین

ڈاکٹر یوسف عالمگیرین کا تعلق شکر گڑھ ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں دودھم کلاں سے ہے۔ وہ پاک فوج کے شعبہ تعلقات عامہ انٹر سروسز پبلک ریلیشنز میں انفارمیشن افسر بھرتی ہوئے اور اب گزشتہ کئی برس سے افواج پاکستان کے ترجمان رسالے ''ہلال'' کے ایڈیٹر ہیں۔ انہوں نے آٹھویں تک گاؤں میں تعلیم حاصل کی، میٹرک کا امتحان ملٹری کالج جہلم سے پاس کیا۔ اسلامیہ کالج لاہور کینٹ میں بھی زیر تعلیم رہے، پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے صحافت کیا۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ایم فل ماس کمیونی کیشن اور پی ایچ ڈی ماس کمیونی کیشن کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ان کا پہلا کالم 'دستک' کے عنوان سے روزنامہ جہاں نما لاہور میں 1990ء میں شائع ہوا، وہ گزشتہ تیس برس سے مختلف موضوعات پر قومی جرائد میں لکھ رہے ہیں۔ ان کی متعدد ادبی کتابیں چھپ چکی ہیں اور پانچ زیر طبع ہیں۔ ان کی زندگی میں مختلف نشیب و فراز آئے اور انہوں نے بہت سی اہم شخصیات کو قریب سے دیکھا۔ قومی ڈائجسٹ نے ان کی دلچسپ یادداشتیں محفوظ کرنے کے لیے حال ہی میں ان کے ساتھ ایک طویل نشست کی ہے۔ لیجیے ان کے احوالِ زندگی انہی کی زبانی سُنیئے!

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میرے آباؤ اجداد کا تعلق ضلع گورداسپور کی تحصیل شکر گڑھ کے موضع دودھم خُرد سے تھا۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد ضلع گرداسپور کو بھی پاکستان میں شامل ہونا تھا لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور پنڈت جواہر لال نہرو کے گٹھ جوڑ کی وجہ سے گرداس پور بھارت کے حصے میں چلا گیا تاکہ بھارت کو جموں و کشمیر تک براہِ راست زمینی راستہ میسر ہو سکے۔ بہر حال خوش قسمتی رہی کہ گورداسپور کی تحصیل شکر گڑھ کو ضلع سیالکوٹ کا حصہ بنا دیا گیا۔ یوں ہمارا خاندان ہجرت کی صعوبتوں اور تکلیفوں سے بچ گیا۔ موضع دودھم خُرد میں زیادہ گھرانے راجپوتوں کے ہیں، گجر برادری کے گھرانے بھی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی نواحی گاؤں دودھم کلاں ہے وہاں زیادہ گھرانے گجر برادری کے ہیں۔ کبڈی، کشتی اور والی بال وہاں کے نوجوانوں کے محبوب مشاغل ہیں۔ سبھی لوگ زراعت کے شعبے سے منسلک ہیں۔ جو بچے پڑھ لکھ جاتے ہیں وہ افواجِ پاکستان، پولیس، محکمہ تعلیم اور دیگر محکموں میں ملازمتیں کرتے ہیں۔ ہمارا تعلق راجپوت کاٹل برادری سے ہے۔ میں نے اپنے بچپن میں جن بزرگوں کو دیکھا اُن پر آج بھی فخر محسوس ہوتا ہے۔ میرے دادا جان لہر بخش بہت دبنگ، دلیر اور منہ پر کھری بات کرنے والے شخص تھے۔ کسی بڑی سے بڑی پنچائیت میں اگر موجود ہوتے تو کوئی بھی شخص جھوٹ یا فریب کے بل بوتے پر بچ نہیں سکتا تھا۔ جھوٹ بولنے پر اُس کے پٹنے کے قوی امکانات موجود ہوتے تھے۔ ان کی دلیری اور صاف گوئی کے درجنوں واقعات ہیں۔ ایک واقعہ یہاں درج کرتا ہوں کہ تقسیم کے وقت ہمارے گاؤں میں ہندوؤں کے دو گھر موجود تھے۔ پیشے کے اعتبار سے بڑھئی (ترکھان) تھے۔ دونوں گھرانے گاؤں کے زمینداروں کے چھوٹے موٹے کام کاج کر کے گزارا کرتے تھے لیکن جب تقسیم کے وقت وہ بھارت جانے لگے تو گاؤں کے کچھ لوگوں نے اُن کا گھیراؤ کر لیا اس کی ایک وجہ تو وہ خبریں تھیں کہ کس طرح بھارت کی جانب سے آنے والے مسلمان گھرانوں جن میں مرد، عورتیں، بچے بوڑھے سبھی شامل تھے پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے۔ لوگوں میں غم و غصہ تھا۔ اس کے علاوہ ایک ہی گاؤں میں رہتے ہوئے کوئی ذاتی عناد بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ ہندوؤں کی ایک بوڑھی مائی نے کسی بچے کو بھیجا کہ چوہدری لہر بخش کو اس بات کی خبر کرو۔ یہ اپنے گھر میں سو رہے تھے تو یہ اُسی طرح بنیان اور تہمد پہنے اپنے ہاتھ میں روایتی لاٹھی (ڈانگ) پکڑے وہاں جا پہنچے اور لوگوں کو سمجھایا اور پیچھے ہٹنے کا کہا انہوں نے اس بوڑھی عورت کو الگ کر کے کہا جو تمہارے زیورات وغیرہ ہیں یا کوئی قیمتی شئے ہے وہ الگ سے پوٹلی میں سنبھال لو۔ یوں اُن لوگوں کو گاؤں سے بحفاظت نکالنے میں میرے دادا جان نے کلیدی کردار ادا کیا۔ بوڑھی ہندو عورت جب گھر کی دہلیز سے نکل رہی تھی تو آواز دے کر میرے دادا جان کو کہا

فوجی اداروں میں چائے اور بے عزتی کا کوئی ٹائم نہیں ہوتا معراج خالد نے کہا ''چھڈو پرے گڈی نوں، پیدل ہی شیزان ہوٹل چلنے آں۔''

Scanned with CamScanner

قومی اخبار میں تنقیدی کالم چھپا تو
نوابزادہ نصراللہ خان کے احتجاج پر مجھے
اخبار سے فارغ کر دیا گیا

''چودھری لہر شام نوں ککڑیاں گھر واپس آئیاں تے اونہاں نوں ٹوکرے تھلے ڈک دیویں، اونہاں نوں کوئی کتا یا بلی نہ کھا جائے۔'' (شام کو جب مرغیاں دانہ دنکا چگ کر واپس آئیں تو اُنہیں بحفاظت ٹوکرے کے نیچے بند کر دینا، مبادا کوئی کُتا یا بلی وغیرہ اُنہیں کھا جائے)۔ میرے دادا کے پانچ بھائی تھے: ایک جوانی ہی میں فوت ہو گئے تھے، باقی چار کو میں نے دیکھا ہے۔ اُن کی اولاد آج بھی آبائی گاؤں ہی میں ہے۔ میں نے اپنے پردادا جان چوہدری چراغ کو بھی دیکھا ہے، اُن کی رحلت 1971ء کی جنگ کے بعد ہوئی۔

1971ء کی جنگ سے پہلے دودھم خُرد میں ہمارا بہت بڑا احاطہ تھا۔ بڑے بڑے کمرے اور بہت بڑا صحن تھا۔ دادا جان کی اولاد اور اُن کے بھائیوں کے بچے بھی اُسی بڑے صحن کے آس پاس اپنے گھروں میں رہتے تھے۔ 1971ء کی جنگ میں جب ہمارا علاقہ بھارت کے قبضے میں چلا گیا تو ہمارے گاؤں کے لوگ اور علاقے کے دوسرے دیہات کے لوگ محفوظ جگہوں کی طرف نکل گئے۔ ہمارے دادا گاؤں چھوڑنے کے حق میں نہیں تھے۔ لہٰذا ہمارا گھر شاید وہ واحد گھر تھا جس کا سارا سامان بھارتی فوج ساتھ لے گئی یا اُس نے ضائع کر دیا تھا۔ جب 1971ء کی جنگ شروع ہونے کا خطرہ ہوا تو میرے والد صاحب، جو پاک فوج میں سروس کر رہے تھے وہ بار بار خط کے ذریعے مطلع کرتے کہ وہاں سے نکل آئیں اور سیالکوٹ ہیڈ مرالہ کے قریب ہمارے ننھیال میں واقع گھر میں چلے جائیں یا پھر بورے والا میں مقیم رشتہ داروں کے پاس چلے جائیں لیکن دادا جان ڈٹے رہے کہ ہمیں کچھ نہیں ہو گا۔ بھارتی فوج کے حملے سے دو تین دن قبل میرے ابو نے میرے چچا جان سرور صاحب کو خط لکھا کہ تم یوسف، اُس کی امی اور میری دو چھوٹی بہنوں کو سیالکوٹ چھوڑ آؤ۔ انہوں نے ہمیں ساتھ لیا، امی نے ایک گرین کلر کے اٹیچی کیس میں چند کپڑے ڈال کر اسے ساتھ رکھ لیا۔ چچا نے ایک گھوڑے والے کو کرائے پر حاصل کیا اور ہمیں چک امرو سٹیشن سے سیالکوٹ والی ٹرین پر بٹھانے نکلے لیکن وہاں رش اور افراتفری دیکھ کر خود بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گئے اور ہمیں ہمارے ننھیال چھوڑ کر جب واپس دودھم خُرد پہنچے تو اگلے ہی روز شام کو بھارتی فوج بارڈر کراس کر کے ہمارے گاؤں پہنچ چکی تھی۔ یوں ہمارے خاندان کے پاس Reactoin ٹائم بھی نہیں تھا۔ انہوں نے حویلی میں بندھے ہوئے جانور کھول دیئے، چولہے پر رات کے لئے کھانا پک رہا تھا وہ بھی وہیں چولہے پر چھوڑا اور صرف اپنی جانیں بچا کر پیدل ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں سنکیال جہاں میری ایک پھوپھو جان بیاہی ہوئی تھیں ان کے پاس جا پہنچے۔ پھر شاید اگلے ہی روز پیر سبز ہیڈ مرالہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہاں چند روز رہنے کے بعد ہمیں بھی ساتھ لیا اور سیالکوٹ سے

ٹرین پر پہلے لاہور، پھر بورے والا پہنچے۔ ہم لوگ بورے والا چک 463/EB میں نانا کے گھر اور 329/EB میں اپنے رشتہ داروں کے پاس رہتے رہے۔

جنگ ختم ہوئی تو جب گاؤں واپس پہنچے تو ہمارے گاؤں کے تمام گھروں کو بھارتی فوج نے بلڈوز کر دیا ہوا تھا۔ میٹھے پانی کے کنویں مٹی ڈال کر بند کر دیئے گئے تھے۔ کئی کنوؤں کی کھدائی شروع کی تو کدال لگنے سے گرنیڈ پھٹتے اور کئی لوگوں کے معذور ہونے کے واقعات ہوئے۔ مجھے یاد ہے جب ہمارے گاؤں میں کنویں کی کھدائی کی جارہی تھی تو ہم بچے ہونے کے ناتے یہ عمل قریب سے دیکھنا چاہتے لیکن بڑوں کو تشویش تھی کہ کوئی گرنیڈ وغیرہ نہ پھٹ جائے لہٰذا ہم اس خطرے کے پیش نظر دور بیٹھ کر یا کسی درخت پر چڑھ کر اس کارروائی کا نظارہ کرتے رہے۔

میں ضلع سیالکوٹ ہیڈ مرالہ کے قریب اپنے ننھیال میں پیدا ہوا۔ میری پیدائش سرٹیفکیٹ کے مطابق 12 جنوری 1967ء ہے یوں 1971ء کی جنگ میں میں چار پانچ سال کا تھا۔ میری یادداشت اچھی ہے۔ مجھے لوگ، اُن کے چہرے، حتیٰ کہ کس رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے بسا اوقات وہ بھی یاد رہ جاتے ہیں۔ مجھے اپنے گاؤں میں جنگ 71ء سے پہلے اور 71ء کے بعد والے حالات آج بھی یاد ہیں۔ میرے پردادا چوہدری چراغ دین بھی مجھے یاد ہیں، میں چھوٹا سا تھا اُن کی چارپائی کے اردگرد اپنے کزنز کے ساتھ کھیلتا کودتا، ان کے پاؤں دباتا۔ ان کا مسکراتا چہرہ مجھے یاد آتا ہے۔ وہ بہت Lovley اور Pleasing سے تھے۔ میری پردادی عائشہ بی بی سابق وفاقی وزیر پروفیسر احسن اقبال کے دادا کی پھوپھو تھیں۔ احسن اقبال کے دادا ڈاکٹر مشتاق علاقے کی بہت بڑی شخصیت تھے اور ان کا سیاسی اثر و رسوخ بہت زیادہ تھا۔ اسی لئے ہمارے خاندان والوں کی جب بھی کسی سے مڈبھیڑ ہوتی یا کوئی پھڈا وغیرہ کر بیٹھتے تو سیدھا ڈاکٹر مشتاق کے پاس جا پہنچتے اور وہ پولیس کو کہہ کر دونوں پارٹیوں میں صلح صفائی کروا دیتے۔ یوں معاملے خوش اسلوبی سے طے ہو جاتے۔ میرے والد بتاتے ہیں کہ وہ میٹرک کے طالب علم تھے جب ہمارے بزرگوں کا شاید پولیس والوں کے ساتھ ہی کوئی پھڈا ہوگیا۔ یہ صبح صبح گھوڑی پر بیٹھ کر ڈاکٹر مشتاق کے گاؤں فتووال پہنچے تو وہ ابھی ناشتہ کر رہے تھے وہ میرے ابو کو دیکھتے ہی ہنس کر بولے ”دودھماں والیو اَج کنوں کُٹیا جے“ (کہ آج کس کی پٹائی کی ہے) یہ ڈاکٹر مشتاق ہی تھے جنہوں نے اپنے بچوں کو بہت اچھی تعلیم دلوائی اور وہ مختلف شعبوں میں کامیاب رہے۔ ان کی بہو آپا نثار فاطمہ وفاقی مجلس شوریٰ کی ممبر رہیں۔

مجھ سے پہلے میرا بھائی پیدا ہوا جو ایک ہفتہ تک زندہ رہنے کے بعد فوت ہوگیا۔ اُس کے بارے میں

1971ء کی جنگ میں ہمارا گاؤں بھارتی قبضے میں چلا گیا۔ گھر کا سامان بھارتی فوج اپنے ساتھ لے گئی

Scanned with CamScanner

حویلی میں جانور بندھے تھے، چولہے پر
رات کا کھانا پک رہا تھا، ہم سب کچھ
چھوڑ کر گاؤں سے نکل پڑے

کہا جاتا ہے کہ اُسے نظر لگ گئی یا کسی نے تعویذ ڈال دیئے۔ اکثر جگہوں پر ایسا سوچا جاتا ہے۔ جب میں پیدا ہوا تو میرے نانا جان چودھری محمد بوٹا نمبردار نے ہر آنے جانے والے پر نظر رکھنا شروع کر دی کسی غیر عورت کو وہ مجھے دیکھنے بھی نہ دیتے پھر میں 22 دن کا ہی تھا تو وہ مجھے ٹرین کے ذریعے چک امرو اور پھر وہاں سے اپنی بانہوں میں اٹھا کر گاؤں دودھم خُرد تک چھوڑ آئے، جہاں میرے دادا چودھری لہر بخش نے میرا نام محمد یوسف رکھا۔ میرے نام رکھنے کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ میں پیدا ہوا تو میرا رنگ بہت Fair تھا۔ دوسرے ان دنوں لوگ شام کو اکٹھے ہو کر بیٹھ جاتے اور کوئی پڑھا لکھا لڑکا، بزرگوں کو حضرت یوسفؑ اور زلیخا کا قصہ سنایا کرتا۔ ہیر وارث شاہ بھی لوگ سنا کرتے تھے۔ شاید یوسف نام اُنہیں پسند آنے کی یہی وجہ تھی۔ میری تاریخ پیدائش کے حوالے سے میرے نانا جان نے اپنی نمبرداری کی کتاب جسے 'وحی' کہا جاتا ہے اُس میں کہیں لکھ رکھا تھا کہ بیٹی کے ہاں بیٹا ہوا۔ 11 چیت (پنجابی مہینہ) اور 25 مارچ 1966ء بہر طور دستاویزات میں 12 جنوری 1967ء ہی درج ہے تو اُسے ہی سرکاری حیثیت حاصل ہے۔ امی بتاتی تھیں جب میں پیدا ہوا تو اُس سے اگلے دن عید کا روز تھا۔

میں کچی جماعت میں پرائمری سکول دودھم کلاں میں داخل ہوا۔ سکول کی کل کائنات ماسٹر صاحب کا ایک میز، دو کرسیاں، ایک لکڑی کا بلیک بورڈ اُس کے ساتھ سٹینڈ اور چار پانچ چاک تھے۔ ماسٹر صاحب کے آنے سے پہلے پانچویں جماعت کے بڑے بڑے بچوں کی ڈیوٹی ہوتی تھی کہ ساتھ کیکر کے درختوں کے نیچے سکول 'قائم' کر دیا جائے۔ جب ماسٹر صاحب جن کا نام منظور صاحب تھا، آتے تو وہ ڈیلرہ کی جانب سے آتے اور ''دودھم کلاں'' کے بالکل ساتھ ایک ندی جسے لوکل زبان میں ''کریز'' کہا جاتا، کے اُس پار کھڑے ہو جاتے۔ پھر گاؤں کا کوئی نوجوان یا ذرا ہمت والے چند سٹوڈنٹس اُنہیں کندھوں پر اٹھا کر ندی پار کرواتے تاکہ ریت اور پانی کی وجہ سے اُن کے جوتے خراب نہ ہو جائیں۔ وہاں سے میں پکی جماعت میں ہوا تو مری کے قریب باڑیاں جہاں میرے والد صاحب کی یونٹ تھی، کے مقام پر مڈل سکول میں داخل ہوا۔ وہاں ایک ماسٹر گلزار صاحب ہوتے تھے مجھے آج بھی یاد ہیں۔ دوسری جماعت میں ہوا تو والد صاحب کی یونٹ تریٹ کے مقام پر منتقل ہوئی تو میں تریٹ پرائمری سکول میں شفٹ ہو گیا۔ وہاں ماسٹر ذوالفقار صاحب اور ماسٹر جاوید صاحب کے نام مجھے یاد ہیں۔ تریٹ سے والد صاحب کی یونٹ مظفر آباد آزاد کشمیر چلی گئی تو ہمیں انہوں نے اپنے گاؤں بھجوا دیا۔ پانچویں جماعت میں مڈل سکول ڈیلرہ میں داخل ہوا۔ یہ وہ وقت تھا جب وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف مذہبی جماعتوں کی تحریک چل رہی تھی۔ گاؤں کے لوگ تحصیل شکر گڑھ جاتے تو

Scanned with CamScanner

مذہبی جماعتوں کی طرف سے پیپلز پارٹی کی حکومت کے خلاف نعرے بازی کا احوال بتاتے۔

ایک نعرہ آج بھی مجھے یاد ہے' دس روپے دا جھاڑو تے 20 روپے دی بالٹی، ہائے پیپل پارٹی، ہائے پیپل پارٹی۔' تحریک کی وجہ سے بچوں کی تعلیمی سرگرمیاں متاثر ہوئیں تو حکومت نے پہلی سے نویں جماعت تک کے بچوں کو بغیر امتحان کے پاس کر دیا۔ یوں میں بھی چھٹی جماعت میں پرموٹ ہو گیا۔ اسی دوران والد صاحب نے مظفر آباد شوکت لائنز کے قریب ایک گھر کرائے پر لے لیا اور ہمیں ساتھ لے گئے۔ میرا داخلہ گورنمنٹ پائیلٹ ہائی سکول نمبر ون میں کروا دیا۔ وہاں کے اساتذۂ کرام میں پیر فضل صاحب، شبیر صاحب، رؤف صاحب اور جاوید صاحب (ہمارے کلاس ٹیچر) مجھے یاد ہیں۔ آزاد کشمیر میں فٹ بال کا کھیل بہت مقبول تھا۔ سکول کے بعد میرے لئے نیلم سٹیڈیم میں پاک فوج کے اتھلیٹکس کے مقابلے اور دیگر کھیلوں کے مقابلے دیکھنا ایک اہم مشغلہ تھا۔ میں چھٹی جماعت میں سکول سے فارغ ہو کر گھر پہنچتا، کھانا کھا کر، سپورٹس ڈریس (نیکر، بنیان اور پی ٹی شوز) پہن کر سیدھا والد صاحب کی یونٹ میں سٹینڈ پر لگے اخبار میں 'ٹارزن کی کہانی' کی اگلی قسط پڑھتا پھر گراؤنڈ میں چلا جاتا۔ جب ساتویں جماعت میں ہوا تو والد صاحب کی یونٹ کیمبر چھاؤنی اوکاڑہ چلی گئی تو میرا داخلہ ایف جی سکول اوکاڑہ میں کروا دیا گیا۔ میں نے آٹھویں کا بورڈ کا امتحان وہیں سے پاس کیا۔ سکول بھر میں میری دوسری پوزیشن تھی۔ سریحی ہمارے کلاس ٹیچر تھے۔ اسی دوران میں نے ملٹری کالج جہلم سرائے عالمگیر کے لئے امتحان دیا جس میں کامیاب رہا۔ یوں میں آٹھویں جماعت پاس کر کے دوبارہ آٹھویں جماعت میں ملٹری کالج داخل ہو گیا۔ ہماری انٹری 3 مئی 1980ء کو ملٹری کالج جہلم سرائے عالمگیر میں رپورٹ ہوئی۔

میری تین بہنیں ہیں اور ہم چار بھائی ہیں۔ دو بھائی روزگار کے سلسلے میں سعودی عرب ہیں ایک بھائی پاکستان ہی میں ہے اور سرکاری ملازمت میں ہے۔ میرے والد محمود عالم صاحب (صوبیدار میجر ریٹائرڈ) راجپوت کاٹل جبکہ والدہ راجپوت منہاس خاندان سے تھیں۔ میرے ابو اور امی دونوں آپس میں خالہ زاد یعنی فرسٹ کزن تھے۔ میرے والد صاحب نے 1958ء میں میٹرک کا امتحان دیا۔ ریاضی میں کمپارٹ آئی جس کو کلیئر کرنے کے لئے انہوں نے دوبارہ کوئی امتحان نہیں دیا اور فوج میں بھرتی ہو گئے اور 1987ء میں صوبیدار میجر کے رینک سے ریٹائرڈ ہوئے۔ وہ اپنے کام میں بہت مہارت رکھتے تھے۔ لکھائی بہت خوبصورت اور بچوں کی تربیت میں سخت واقع ہوئے تھے۔ مجھے حکم تھا کہ مغرب کی اذان آپ لوگوں کو گھر میں ہونی چاہئے جس کی ہم نے ہمیشہ تعمیل کی۔ میری پڑھائی کا بہت خیال رکھا۔ جہاں جہاں پوسٹنگ ہوئی ہمیں ساتھ

جنگ ختم ہونے کے بعد گاؤں پہنچے تو ہمارے گھر مسمار ہو چکے تھے، جنگ 71ء کی تلخ یادیں آج بھی میرے ذہن سے محو نہیں ہوئیں

Scanned with CamScanner

زیڈ اے سلہری کی صحافت سے بہت متاثر ہوا۔ انہوں نے صحافت کو ایک مشن سمجھا، انہوں نے مجھ سے سوال کیا، کیا بننا چاہتے ہو؟ میں نے جواب دیا، زیڈ اے سلہری!

ساتھ رکھتے۔ چھٹی جماعت تک ہم کبھی گاؤں اور کبھی جس جگہ ان کی پوسٹنگ ہوتی، وہاں جاتے، لیکن چھٹی جماعت سے لے کر ان کی ریٹائرمنٹ تک ہم ان کے ساتھ رہے۔ میں آٹھویں میں ملٹری کالج کے لئے سلیکٹ ہوا تو یہ بھی والد محترم کا وژن تھا۔ جن دنوں میں تیاری کر رہا تھا تو وہ رات کو بہت دیر تک میرے ساتھ جاگتے اور مجھے تیاری کرواتے اور کبھی کبھار صحیح طرح سے سبق یاد نہ کرنے پر ہلکی پھلکی مرمت بھی کرتے، میں ساتھ ساتھ آنسو پونچھتا اور ساتھ دیئے گئے سوالات یاد بھی کر رہا ہوتا۔ ان کا میرے دل میں خوف بہت تھا۔ اس لئے شاید ان کے ساتھ کبھی اس طرح سے ''فرینک نیس'' نہیں ہو سکی جس طرح آج کل کے بچے اپنے والدین کے ساتھ فرینک ہوتے ہیں بلکہ کبھی کبھار 'لائیٹ' بھی لے لیتے ہیں۔ شاید وقت تبدیل ہو گیا ہے۔

میں فرسٹ ایئر میں تھا کہ ایک دفعہ کسی دوست کی طرف گیا، وہاں کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی۔ میں جب گھر داخل ہوا تو ابو نے پوچھا اتنی دیر کیوں ہو گئی تو میں نے ویسے ہی کہہ دیا کہ سائیکل پنکچر ہو گئی تھی۔ ابو نے بیٹ مین سے کہا تم صبح سائیکل کو پنکچر لگوا دینا۔ سائیکل میں ہوا ذرا کم کی تھی' جو میں نے ہی کی تھی' وہ پنکچر تو نہیں تھی لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب بیٹ مین نے واپس آ کر ابو سے دو پنکچروں کے پیسے لئے۔ میں نے اس پر شکر ادا کیا کہ کہیں اس نے آ کر یہ نہیں کہہ دیا کہ میں نے ٹائر کی ٹیوب تبدیل کرا دی ہے۔

والد صاحب کی قدرے سخت تربیت اس طرح کام آئی کہ الحمدللہ آج تک زندگی میں کوئی بڑی گڑبڑ نہیں کی۔ چھوٹی موٹی کوتاہیاں ہر کسی سے ہو جاتی ہیں اللہ معاف فرمانے والا ہے۔ ہمیشہ لوگوں کے حوالے سے نیت اچھی رکھی اور مثبت سوچ رکھی۔ دوستوں اور تعلق داروں کی ہمیشہ قدر کی اور رزقِ حلال کمایا۔ ہمارے والد نے بھی ہمیں حلال رزق کما کر کھلایا۔ جہاں تک والد صاحب کے مشاغل کا تعلق ہے تو فوج جوائن کرنے سے پہلے اپنے علاقے میں کبڈی کے بہترین کھلاڑی کے طور پر مانے جاتے تھے۔ والی بال کے بھی اچھے کھلاڑی تھے۔ سو میٹر، دو سو میٹر اور کراس کنٹری میں بہت اچھے تھے۔ جسمانی اور ذہنی طور پر ایک مکمل فٹ انسان کے طور پر زندگی بسر کی۔ آج وہ اسی برس سے اوپر ہیں لیکن الحمدللہ اچھی صحت ہے اور دل پر کوئی بوجھ نہیں۔ کبھی کسی سے زیادتی نہیں کی اور ہمیشہ حق سچ کا ساتھ دیا۔

والدہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ اپنا نام لکھ لیتی تھیں۔ لیکن جب میں نے تختی لکھنی شروع کی تو وہ مجھے ''پورنے'' ڈال کر دیتی تھیں۔ (مطلب کہ مجھے کچی پنسل سے لکھ کر دیتی تھیں اور میں پھر قلم دوات سے اس پر لکھا کرتا)۔ والدہ صاحبہ قرآن شریف باقاعدگی سے پڑھتی تھیں۔ اپنے بچوں بالخصوص بڑا

Scanned with CamScanner

بیٹا ہونے کے ناتے میرے حوالے سے بہت Posessive تھیں۔ جب ہم مری کے قریب باڑیاں میں تھے جہاں میں پہلی جماعت میں پڑھتا تھا تو جو سرکاری مکان ملا ہوا تھا وہ بہت کشادہ اور انگریز سٹائل کی بلڈنگ تھی جس کے چاروں طرف درخت، ہریالی اور پھر سردیوں میں شدید برف باری ہوتی۔ جو سرکاری پانی کے نل تھے اُن میں پانی جم جاتا لہٰذا والدہ اور دیگر خواتین جو برف چھت سے لٹکی ہوتی اُسے اُتار کر چولہے پر گرم کر کے اس پانی کو ململ کے کپڑے سے چھان کر استعمال میں لاتیں۔ ہم کبھی گھر کی پچھلی جانب اُترتے تو میں اور امی برف کے گولے بنا کر ایک دوسرے کو مارتے جس پر ابو سے کئی مرتبہ ہمیں جھاڑ بھی پڑتی۔ باڑیاں بہت خوبصورت جگہ تھی۔ آلو بخارے، انار، اخروٹ، سیب کے درخت وافر تھے۔ ہمارے گھر کے سامنے درخت پر اکثر بندر چڑھے دکھائی دیتے۔ کبھی کبھار رات کو ہمارے گھر کی اچانک لائٹ آف ہو جاتی، ابو باہر نکلتے تو میٹر بند ہوتا۔ ایک دن ابو ڈنڈا پکڑ کر دروازے کے پیچھے چھپ گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ جیسے ہی لائٹ آف ہوئی تو ابو فوراً باہر نکلے تو ایک بڑا سا بندر میٹر آف کر رہا تھا، ابو نے ڈنڈا مارا تو بھاگ گیا۔ اس کے بعد کافی دن تک افاقہ رہا۔

یہ باڑیاں والا گھر ہی تھا جہاں میں نے امی ابو کے منہ سے پہلی مرتبہ سنا کہ ہم کوشش کریں گے کہ یوسف جب آٹھویں میں ہوا تو ملٹری کالج کے لئے امتحان دلوائیں گے۔ بچے وہیں ہوسٹل میں رہتے ہیں۔ بہترین انسٹرکٹرز اور ماحول ہوتا ہے اور بچوں کی اچھی تربیت ہو جاتی ہے۔ میں نے سُنا تو میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے کہ مجھے ملٹری کالج نہیں جانا۔ اس پر امی ہنسنے لگیں کہ تمہیں ابھی تھوڑا بھیج رہے ہیں۔ آٹھویں میں تم بڑے ہو جاؤ گے اور خوشی خوشی ملٹری کالج جاؤ گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میں نے جب گیمبر چھاؤنی اوکاڑہ سے ملٹری کالج کے لئے امتحان دیا، سلیکٹ ہوا تو خوشی خوشی جا رہا تھا لیکن اس دن امی رو رہی تھیں۔ میں اپنے ٹرنک اور دیگر سامان کے ساتھ گیمبر چھاؤنی کے سٹیڈیم کے سامنے والے سٹاپ پر جس ٹانگے پر سوار ہو کر ابو کے ساتھ گیمبر بس سٹاپ کے لئے روانہ ہو رہا تھا امی کھڑی ہمیں دیکھتی رہیں۔ پھر گھر کی طرف چل پڑیں۔ میری اپنی والدہ کے ساتھ بہت وابستگی تھی۔ میں ان سے اپنی کوئی بات آسانی سے کر لیتا تھا لیکن ابو کے ساتھ یہ معاملہ نہیں تھا۔ مجھے ملٹری کالج چھوڑ کر ابو جب واپس گھر گئے تو میری امی نے کئی دن تک ان سے بات نہیں کی۔ پھر کچھ دنوں بعد ہی امی نے ابو سے کہا کہ یوسف کی تصویر جو ملٹری کالج جانے کے لئے کھنچوائی تھی، کو بڑی کروا کر فریم کروا کر گھر میں رکھیں جس کی ابو نے تعمیل کی۔

میرے ددھیال اور ننھیال دونوں گھرانے کٹر مذہبی گھرانے نہیں تھے۔ بس جس طرح نارمل مسلمانوں کے گھرانے ہوتے ہیں ویسے ہی تھے کسی

فضل الرحمٰن لاہوری کو ''مجاہد اردو'' کا خطاب

ڈاکٹر سید عبداللہ نے مال روڈ پر انگریزی کے سائن بورڈ توڑنے پر دیا

Scanned with CamScanner

اردو کو قومی زبان کا درجہ نہ دینے کی پاداش
میں مجاہدِ اردو فضل الرحمٰن نے وزیرِ اعظم بھٹو کی
سٹاف کار کے بونٹ پر مکا رسید کر دیا

معاملے میں بہت زیادہ شدت نہیں تھی۔ ددھیال کی جانب مورل ویلیوز، کردار اور کھری بات کرنے کا رجحان زیادہ تھا۔ ددھیال والے ذرا اکھڑ ٹائپ تھے۔ اب وہ اکھڑ پن نہیں رہا۔ اب اگلی نسل پڑھ لکھ گئی ہے۔ اعتدال پسندی ہے۔ برسرِ روزگار ہیں اور باوقار زندگیاں بسر کر رہے ہیں۔ جبکہ ننھیال سائیڈ ذرا ڈپلومیٹک واقع ہوئی ہے۔ دودھیال اور ننھیال دونوں سائیڈز پر کسی کو سیاست سے زیادہ لگاؤ نہیں تھا۔ جب ووٹنگ ہوتی تو اپنی اپنی پسند کے اُمیدوار کو جا کر ووٹ ڈال آتے۔

میں اس طرح کا شرارتی نہیں تھا جس سے کبھی کسی کو کوئی نقصان پہنچا ہو، باقی ہلکی پھلکی شرارتیں تو چلتی تھیں۔ میں شاید تیسری جماعت میں تھا تو ان دنوں اپنے ننھیال کے قریب واقع ایک گاؤں میں داخل تھا ان دنوں تشنج کے انجکشن لگانے والی محکمہ صحت کی ٹیمیں سکولوں میں جا کر انجکشن لگاتی تھیں۔ ہماری کلاس میں آئے تو کلاس ٹیچر نے مجھے کہا کہ ایک ایک بچے کو ٹیم کے سامنے لاتے جاؤ اور انجکشن لگواتے جاؤ۔ کچھ بچے دیگر ڈیوٹیوں پر مامور کئے گئے۔ انجکشن لگنے شروع ہوئے تو کلاس میں ہر طرف آہ و بُکا کا عالم تھا تقریباً سبھی بچے رو رہے تھے۔ میرا دل بھی پسیج چکا تھا لیکن میں اپنے فرائض منصبی 'بطریقِ احسن' سرانجام دے رہا تھا۔ جب ایک دو بچے رہ گئے تو اُس کے بعد انجکشن لگانے کی میری باری بھی آنی تھی۔ میں نے اُن دو بچوں کو اُدھر ہی چھوڑا اور کھڑکی سے کود کر دوڑ لگا دی۔ ماسٹر صاحب نے پانچویں جماعت کے بچے جن میں بعض بہت لیٹ داخل ہوتے ہیں اور کافی بڑے ہو چکے ہوتے ہیں، میرے پیچھے لگا دیئے کہ اسے پکڑ کر لاؤ۔ یوں میں تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ دھر لیا گیا۔ جب مجھے وہ کلاس کے اندر لے کر آئے تو ماسٹر صاحب سمیت محکمہ صحت کی ساری ٹیم ہنس رہی تھی اُن میں سے کسی ایک نے میرا بازو پکڑا اور انجکشن لگا دیا اور کہا لو بھئی اتنا سا کام تھا۔ بچوں نے خواہ مخواہ کلاس میں شور مچایا ہوا ہے۔ اس انجکشن کو عرفِ عام میں ''ماتا کا ٹیکا'' کہتے تھے۔ ہماری نسل کے دائیں یا بائیں بازو پر آج بھی اُس چیچک کے ٹیکے کا نشان ہے۔ ویسے عرصہ دراز سے ہماری قوم کو بڑے بڑے ٹیکے لگتے چلے آ رہے ہیں لیکن نشان نہیں چھوڑا جاتا۔

میں خود کو اوسط درجے کے طلباء ہی میں شمار کروں گا، نہ انتہائی ذہین اور نہ انتہائی نالائق تھا۔ میری تعلیمی کارکردگی عمومی طور پر ساٹھ پرسنٹ والی فرسٹ ڈویژن کے اردگرد ہی گھومتی رہی۔ میٹرک میں فرسٹ ڈویژن، ایف اے میں سیکنڈ، بی اے میں فرسٹ ڈویژن، ایم اے میں سیکنڈ، ایم فل میں فرسٹ ڈویژن اور پی ایچ ڈی میں بھی الحمدللہ اے گریڈ ہے۔ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز (نمل) سے 2004ء میں ایک سپیشل ڈپلومہ اِن انگلش لینگویج کیا تھا اُس میں بھی فرسٹ ڈویژن

تھی۔

میں جن مختلف تعلیمی اداروں اور جن جماعتوں میں پڑھتا رہا اُس کا احوال تو پہلے بیان کر چکا ہوں۔ پہلی دفعہ ہاسٹل میں رہنے کا موقع تب ملا جب میں مئی 1980ء میں ملٹری کالج جہلم سرائے عالمگیر میں داخل ہوا۔ ملٹری کالج میں گزرے تین برس اَن گِنت یادوں اور بہترین دنوں کی یاد دلاتے ہیں۔ وہاں سے میں نے 1983ء میں میٹرک کیا۔ لیکن ملٹری کالج میں ہمارے ساتھ ہاتھ ہوگیا۔ شاید 1981ء میں ہونے والے یوم والدین کے موقع پر وائس چیف آف آرمی سٹاف جنرل سوار خان بطور مہمان خصوصی تشریف لائے اور انہوں نے خوشخبری سنائی کہ اب جونیئر کیڈٹ بٹالین (جے سی بی) کے کیڈٹس بھی دو سال کے لئے ملٹری کالج میں ٹریننگ کیا کریں گے۔ اس طرح آپ لوگ جب میٹرک کر کے جے سی بی کے لئے سلیکٹ ہو جائیں گے تو پھر سے اپنے ہی کالج میں دو سال کی ٹریننگ کریں گے اور پھر یہاں سے سیدھا (پی ایم اے) پاکستان ملٹری اکیڈمی رپورٹ کریں گے وہاں سے دو سال کی تعلیمی و عسکری تربیت کے بعد پاک فوج جوائن کریں گے۔ ہم نے اس بات کو رومینٹی ہی میں لیا اور ہمارے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ اگلے ایک دو سال میں قسمت ہمارے ساتھ کیا کھیل کھیلنے جا رہی ہے۔ ہماری اینٹری نے 15 جے سی بی کے لئے اپلائی کیا جو کیڈٹس سلیکٹ ہو گئے وہ مختلف مقامات پر ہونے والی ٹریننگ کے لئے بھجوا دیے گئے۔ لیکن جو کیڈٹس سلیکٹ نہیں ہوئے انہیں ملٹری کالج سے ایف ایس سی کرنے کا جو موقع ملنا تھا وہ اُس سے اس طرح محروم ہو گئے کہ ان کے ہاسٹلز اور کلاسز کو جونیئر کیڈٹ بٹالین کے کیڈٹس کے لئے مختص کر دیا گیا تھا۔ یوں جو کیڈٹس جے سی بی کے لئے کوالیفائی نہ کر سکے انہیں ملٹری کالج جہلم بھی میٹرک کے بعد ہی چھوڑنا پڑا۔ یوں ہم ٹھیک تین سال کے بعد اپنا ایک تعلیمی سال ضائع کر کے (میں 1980ء میں آٹھویں جماعت پاس کر کے ملٹری کالج میں دوبارہ سے آٹھویں جماعت میں داخل ہوا تھا) پھر اُسی تعلیمی ماحول میں واپس آ گئے جو چھوڑ کر گئے تھے۔

اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ میری مختصر سی زندگی جو بہت ہموار چل رہی تھی میں مجھے ایک جھٹکا 1983ء ہی میں لگ گیا اور یوں محسوس ہوا جیسے دنیا تاریک ہو گئی۔ ہمارے وہ ساتھی جن کے ساتھ ہم پی ایم اے اور کاکول کی باتیں کرتے تھے اور اگلی زندگی کے بارے میں بات چیت کرتے تھے وہ ہم سے بچھڑ گئے۔ گویا 16 سال کی عمر ہی سے زندگی نے ایک ایسا موڑ کاٹا جس سے زندگی کا سفر کٹھن اور پُرخار ہوتا چلا گیا۔

مجھے ملٹری کالج جہلم سے جے سی بی کے لئے سلیکٹ ہونے کا اتنا یقین تھا کہ میں نے سوائے گورنمنٹ کالج لاہور کے کسی اور کالج میں داخلہ فارم بھی جمع نہیں کروایا تھا۔ میری میٹرک میں فرسٹ

مجاہد اردو رفیق تارڑ کے خلاف صدارتی امیدوار تھے

وہ اس حد تک پر یقین تھے کہ انہوں نے

اپنی کابینہ بھی اناؤنس کر رکھی تھی

Scanned with CamScanner

اُس چیچک کے ٹیکے کا نشان ہے، ویسے عرصہ دراز سے
ہماری قوم کو بڑے بڑے ٹیکے لگتے چلے آ رہے
ہیں لیکن نشان نہیں چھوڑا جاتا

ڈویژن تھی لیکن ظاہر ہے گورنمنٹ کالج کے لئے میرٹ کافی ہائی ہوتا ہے۔ لہٰذا میں نے سپورٹس کی بنیاد پر فارم میں حوالہ دیا ہوا تھا لیکن جس دن میرا سپورٹس کے لئے باسکٹ کا ٹرائل تھا (میں ملٹری کالج میں باسکٹ بال کا کلر ہولڈر اور بیسٹ پلیئر تھا) اسی دن مجھے کوہاٹ آئی ایس ایس بی کے لئے رپورٹ بھی کرنا تھی تو میں کوہاٹ چلا گیا۔ آنکھ تب کھلی جب میری سلیکشن نہ ہو سکی۔ گورنمنٹ کالج گیا تو وائس پرنسپل نے فرمایا کہ اب ڈیٹ گزر چکی ہے اب گورنمنٹ کالج تو کیا لاہور کے کسی بھی کالج میں تمہارا داخلہ نہیں ہوگا۔ آپ کو دیگر کالجوں میں بھی فارم جمع کروانے چاہئیں تھے۔ ایسا ہی ہوا۔ بعد میں بڑی مشکلوں سے گورنمنٹ اسلامیہ کالج لاہور کینٹ میں داخلہ ملا اُس کے لئے بھی پرنسپل پروفیسر شمیم فرحت چغتائی صاحب نے شاید ڈائریکٹر ایجوکیشن سے خصوصی اجازت حاصل کی تھی کہ کیڈٹ کالج کا پڑھا ہوا لڑکا ہے۔ داخلہ لیٹ ہو گیا ہے۔ اس کالج میں داخل تو ہو گیا لیکن وہاں پڑھائی والا اُس طرح سے ماحول نہیں تھا۔ وہاں بہت کم نمبروں والے بچے تھے جن کی خاص توجہ پڑھائی کی جانب نہ تھی۔ داخلہ فیس جمع کرانے کا مرحلہ آیا تو میں کلیریکل سٹاف کے دفتر کے سامنے کھڑا تھا میں نے ایک باریش انسان کو دیکھا (جن کے بارے میں بعد میں معلوم ہوا کہ وہ وائس پرنسپل تھے) وہ ہر وقت تسبیح کرتے رہتے۔ میں نے پوچھا سر فیس کہاں جمع کرانی ہے، بجائے اس کے کہ وہ کلیریکل آفس کی کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے، انہوں نے کہا پُتر جی فیس بینک میں جمع ہونی ہے۔ میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر کالج سے نکلا اور صدر بازار گول چوک میں قائم بینک میں جا پہنچا۔ کچھ دیر لائن میں لگا رہا۔ باری آئی تو میں نے فیس جمع کرانا چاہی، انہوں نے کہا آپ پہلے سٹوڈنٹ ہیں جو بینک میں فیس جمع کروانے آ گئے ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم شاید ہمارے بینک کی مین برانچ میں ہو رہے ہوں۔ میں وہاں سے پیدل مین برانچ جو صدر بازار ہی میں تھی پہنچا، وہاں بھی ایک لمبی لائن تھی، جب مطلوبہ کاؤنٹر پر پہنچا تو انہوں نے کہا یہ کالج والے خود جمع کرتے ہیں۔ آپ سے کسی بندے نے مذاق کیا ہے۔ میں نے کہا ایسا ہو ہی نہیں سکتا وہ ایک بزرگ سی شخصیت تھی شاید وہ کالج کے کوئی پروفیسر ہی ہوں، انہوں نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔ میں واپس کالج گیا تو کلیریکل سٹاف چھٹی کر چکا تھا۔ اگلے دن صبح صبح ان کے پاس گیا تو انہوں نے کہا پرنسپل صاحب نے تمہیں صرف کل کے لئے اجازت دی تھی۔ آج دوبارہ پرنسپل سے ملو اور اجازت حاصل کرو۔ میں پھر پرنسپل آفس کے باہر بیٹھ گیا۔ اندر جانے کی اجازت ملی تو مدعا بیان کیا، انہوں نے اکاؤنٹ کلرک کو بُلایا اور کہا کہ اس کی فیس جمع کر لو۔ یوں یہ مرحلہ مکمل ہوا۔

اس کالج میں داخلہ ملنے سے بہرحال یہ فائدہ ہوا کہ مجھے پروفیسر اجمل نیازی صاحب جیسی

Scanned with CamScanner

شخصیت سے فیض حاصل کرنے کا موقع میسر آ گیا۔ میں نے کالج میگزین ''سرچشمہ'' کے لئے ایک مضمون لکھ کر متعلقہ سٹاف کے حوالے کیا تو تھوڑی دیر بعد مجھے ایک سٹوڈنٹ بُلانے آیا کہ پروفیسر اجمل نیازی صاحب بُلا رہے ہیں اُس وقت تک اُنہوں نے پی ایچ ڈی نہیں کی تھی اور ڈاکٹر نہیں کہلاتے تھے۔ میں ان کے پاس گیا تو کالج کے لان میں ایک دائرے میں کرسیوں پر دیگر پروفیسر صاحبان تشریف فرما تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے یہ مضمون تم نے لکھا ہے؟ میں نے اثبات میں جواب دیا تو کہنے لگے یہ 'سرچشمہ' کے اس شمارے کا بہترین مضمون ہے۔ تم آج سے کالج میگزین 'سرچشمہ' کے سٹوڈنٹ مدیر ہو۔ یوں میری خوش بختی رہی کہ محترم اجمل نیازی صاحب جیسی حوصلہ افزائی کرنے والی شخصیت کی مجھے سرپرستی حاصل ہوگئی۔ میں اُس کالج کا سینئر پراکٹر بھی تھا۔ نیشنل کیڈٹ کور (این سی سی) کے دستے کا کمانڈر بھی تھا۔ میری قیادت میں کالج کے این سی سی دستے نے 23 مارچ 1984ء اور 23 مارچ 1985ء کو پاکستان ڈے کے موقع پر ہونے والی پریڈ میں گورنر پنجاب جنرل غلام جیلانی خان کو فورٹریس سٹیڈیم لاہور میں سلامی پیش کی۔ ملٹری کالج کی تربیت کی وجہ سے میری ڈرل بہت شاندار تھی اور پریڈ کے لئے دیا جانے والا کاشن بھی بہت اعلیٰ تھا۔ مجھے NCC کا بیسٹ کیڈٹ کا ایوارڈ دیا گیا میں نے یہ ایوارڈ 31 مارچ 1984ء کو کور ہیڈ کوارٹرز لاہور میں ہونے والی تقریب میں کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل سردار ایف ایس لودھی سے وصول کیا جبکہ وویمن گارڈ کی بہترین کیڈٹ کا ایوارڈ کنیئرڈ کالج کی طالبہ نغمہ فاروقی نے وصول کیا۔ اسی طرح میں نے 23 مارچ 1985ء میں بھی کالج دستے کی قیادت کیا اور 31 مارچ 1985ء کو کور ہیڈ کوارٹرز لاہور میں اس وقت کے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل محمد اسلم شاہ سے شیلڈ وصول کی۔ وویمن گارڈز کی شیلڈ کنیئرڈ کالج کی عظمیٰ لودھی نے وصول کی۔ دیگر کالجوں میں ڈویژنل پبلک سکول کے طالب علم عابد ظفر، اپوا کالج کی سعدیہ صوفی اور کوئین میری کالج کی عالیہ پیرزادہ نے سرٹیفکیٹ وصول کئے تھے۔

میں 30 مارچ 1985ء کو ریہرسل کے لئے کور ہیڈ کوارٹرز گیا تو وہاں بریگیڈیئر نصراللہ جو کنڈکٹ کر رہے تھے نے مجھے پہچان لیا اور کہا ''یوسف یو ہیو کم اگین ٹو ریسو دا ایوارڈ'' (یوسف آپ ایوارڈ لینے اس برس پھر سے آ گئے ہیں) میں نے اس بات پر خود کو بڑا elevated محسوس کیا۔ اُن دنوں کیپٹن صولت رضا (بعد میں بریگیڈیئر) وہاں آئی ایس پی آر کی جانب سے پی آر او تھے لیکن ظاہر ہے اُس وقت اُن سے اس طرح ملاقات نہیں تھی اور نہ معلوم تھا کہ وہ وہاں تعینات ہیں۔

میری خوش بختی ہے کہ میرا اپنے اساتذہ کرام کے ساتھ ہمیشہ عقیدت اور احترام والا معاملہ رہا۔ میں الحمدللہ ایک مہذب سٹوڈنٹ تھا۔ کچی جماعت

میں سیکنڈ ایئر کا طالب علم تھا، میں نے کور کمانڈر لاہور لیفٹیننٹ جنرل اسلم شاہ کو خط لکھ دیا کہ آپ سے ملنا چاہتا ہوں

Scanned with CamScanner

اس وقت حیرت کی انتہا نہ رہی جب کور کمانڈر لاہور نے ایک سیکنڈ ایئر کے طالب علم کو ملاقات کے لیے وقت دے دیا

میں تھا تو ماسٹر منظور صاحب ہوا کرتے تھے وہ میرے والد صاحب کے کلاس فیلو تھے تو مجھے اُن سے بہت اپنائیت محسوس ہوتی، اسی طرح ڈیلرہ مڈل سکول کے جو ہیڈ ماسٹر تھے وہ کسی دور میں میرے والد صاحب کے بھی ٹیچر تھے، تو وہ آتے جاتے میرا اور میرے ابو کا احوال پوچھتے۔ پہلی جماعت میں مڈل سکول باڑیاں (مری) میں ہمارے کلاس ٹیچر ماسٹر گلزار صاحب ہوتے تھے، انہوں نے ایک دفعہ بچوں کو سامنے والے پہاڑ سے پودینہ لانے کو کہا۔ میں بھی کلاس کے ہمراہ چلا گیا مجھے پودینے کی پہچان نہ تھی۔ میں نے مقامی لڑکوں سے پوچھا تو انہوں نے نجانے کون کون سی بوٹیوں کے بارے میں مجھے بتایا کہ یہ پودینہ ہے۔ یوں جب کلاس میں واپس آ کر سب بچوں نے پودینہ پیش کیا تو ان میں سے میری کولیکشن منفرد تھی۔ اس پر ماسٹر گلزار حیران ہوئے اور پوچھا کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ میں نے بتایا کہ سیالکوٹ کا۔ کہنے لگے یہاں کس کے پاس ہو؟ میں نے بتایا کہ والد صاحب آرمی میں ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے کبھی کسی کام کے لئے لوکل بچوں کے ساتھ نہیں بھیجا اور مجھے اپنے پاس بٹھائے رکھتے۔ میں پہلی جماعت ہی میں تھا تو سکول اسمبلی میں اعلان ہوا کہ کل ہماری چھٹی ہے لیکن ایک تقریب ہے تو بچے بے شک سکول یونیفارم کے بغیر آئیں اور تقریب میں شرکت کریں۔ میں نے امی کو بتایا کہ مجھے کل ایک تقریب میں جانا ہے تو وہ مسکرائیں کہ تم نے کون سی تقریب میں جانا ہے؟ خیر انہوں اگلے دن مجھے پینٹ شرٹ پہنائی، بالوں کو تیل لگا کر کنگھی کی، آنکھوں میں سرمہ ڈالا، گردن پر پاؤڈر وغیرہ لگا کر تیار کر کے سکول بھیج دیا وہاں گیا تو بچے بہت کم تھے۔ سینئر کلاس کے لڑکوں نے کہا تم اتنے چھوٹے سے ہو، تم کدھر آ گئے ہو؟ اس کے لئے تو باڑیاں کے ساتھ نیچے ایک گاؤں کی مسجد ہے وہاں تقریب ہے۔ خیر وہ مجھے ساتھ لے گئے۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب وہاں پہلے سے موجود تھے مجھے دیکھ کر اُنہیں بہت حیرانی اور خوشی ہوئی اور مجھے سب سے اگلی صف میں بٹھا دیا۔ اور وہاں لوگوں کو بتایا کہ یہ میرے سکول کا سٹوڈنٹ ہے، تقریب اٹینڈ کرنے آیا ہے۔ تقریب کے دوران بھی وہ مسلسل مجھے دیکھتے رہے اور مسکراتے رہے۔ تقریب کے بعد مجھے شاباش دی۔ اگلے روز اسمبلی میں انہوں نے سینئر کلاسز کے بچوں کو سخت سست قرار دیا کہ تم لوگ نہیں آئے یہ چھوٹا سا بچہ ہمارے کہنے پر وہاں پہنچا ہوا تھا۔ بعد میں اُن سینئرز میں سے ایک دو نے مجھے تڑیاں بھی لگائیں کہ ''توں کی اُتھے جانے نی کیہ لوڑ سی آں، خامخواہ اساں نی وی بے عزتی کرادتی آ'' (کہ تمہیں وہاں جانے کی کیا پڑی تھی خواہ مخواہ ہماری بھی بے عزتی ہوئی تمہاری وجہ سے) خیر میں نے باقی ٹائم ان لڑکوں سے بچ بچا کر گزارا۔

پرائمری سکول تریٹ میں ذوالفقار صاحب ہیڈ ماسٹر ہوا کرتے تھے۔ ساتھ ماسٹر جاوید صاحب

Scanned with CamScanner

دادا نے بڑھیا سے کہا جو تمہارے زیورات ہیں وہ الگ سے پوٹلی میں سنبھال لو، یوں اُن لوگوں کو گاؤں سے بحفاظت نکالنے میں میرے دادا جان نے کلیدی کردار ادا کیا

چودھری صاحب تھے وہ میتھ پڑھاتے تھے ان کا شمار بہترین اساتذہ میں ہوتا تھا۔ میرے جیسا ریاضی میں کمزور سٹوڈنٹ بھی ان سے پڑھ کر ریاضی کو کچھ نہ کچھ سمجھنے میں کامیاب ہو جاتا۔ پروفیسر سعید راشد کا انداز بہت مختلف تھا وہ سٹوڈنٹس کو مارنے یا سختی کے عادی نہیں تھے۔ پروفیسر طارق چودھری صاحب کا رویہ بھی بہت شفقت آمیز رہا لیکن جہاں ضرورت پڑتی وہ سرزنش سے گریز نہ کرتے۔ یقیناً بچوں کی زندگیاں سنوارنے کے لئے یہ بھی اتنی ہی ضروری ہوتی ہے جتنی کہ شفقت۔ پروفیسر لطیف صاحب آرٹس کے ٹیچر تھے، جو کمال کے مصور اور آرٹسٹ تھے۔ پروفیسر عین الدین علوی صاحب بھی پروفیسر سعید راشد کی طرح علی گڑھ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے۔ سر شفیق اور پروفیسر رشید صاحب بھی اپنا ایک انداز رکھتے۔ ماشاء اللہ یہ سارے اساتذہ ایسے ہیں کہ ان پر الگ الگ کتاب بن سکتی ہے۔ کبھی اللہ نے توفیق دی تو اپنے اساتذہ کے حوالے سے بہت تفصیل سے لکھوں گا۔ ان کے علاوہ متعدد یونیفارم آفیسرز تھے جو ہمارے انسٹرکٹرز تھے، اُن کی تربیت کا انداز بھی مثالی تھا اور یہ اُنہی کی کاوش ہے کہ آج ہمارے جیسے کئی بچے مختلف میدانوں میں اپنے اپنے حصے کی شمع جلائے ہوئے ہیں۔

میں چونکہ آٹھویں جماعت میں پہلی دفعہ گھر سے اکیلا کسی دوسری جگہ منتقل ہوا اور ملٹری کالج جہلم سرائے عالمگیر کے لئے سلیکٹ ہو کر ایک فوجی تعلیمی و تربیتی ماحول میں رہنے کا موقع ملا تو اس حوالے سے بہت یادیں ہیں۔ جس طرح وہاں کیڈٹس کی گرومنگ کی جاتی ہے اور جس طرح سے سول اور ملٹری اساتذہ کیڈٹس کو گائیڈ کرتے ہیں اور تربیت فراہم کرتے ہیں یہ ملٹری کالج جیسے اداروں ہی کا خاصا ہے۔ اب یہ کیڈٹس کا اپنا نصیب ہے کہ قدرت نے اُس کا رزق یونیفارم کی نوکری میں لکھا ہوتا ہے یا کسی اور پروفیشن میں۔ بہرکیف یہ میری خوش بختی رہی کہ مجھے ملٹری کالج جہلم میں پڑھنے کا موقع ملا۔ ملٹری کالج میں پہلا روز آج بھی لمحہ لمحہ میری آنکھوں کے سامنے ہے کالج گیٹ پر جس طرح ہمارا استقبال کیا گیا اور شیر شاہ ہاؤس کی جانب ریفر کیا گیا، وہ منظر آنکھوں کے سامنے ہے۔ ہمارے سینئر کیڈٹس اس کام پر مامور تھے کہ وہ ہمارے ٹرنک شیر شاہ ہاؤس میں پہنچا رہے تھے اور نئے آنے والے کیڈٹس اپنے والدین کے ہمراہ شیر شاہ ہاؤس میں داخل ہوتے تو وہاں شیر شاہ ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر پروفیسر سعید راشد سفید پینٹ شرٹ زیب تن کئے ہر کسی کا مسکراتے چہرے کے ساتھ استقبال کئے جا رہے تھے اور کیڈٹس کو کالج نمبرز الاٹ کئے جا رہے تھے۔ پھر وہی کالج نمبر ملٹری کالج میں دوران تعلیم اور تعلیم کے بعد اُس کا زندگی بھر کا حوالہ بن جاتا ہے۔ اس مرحلے سے فارغ ہو کر والدین ایک ایک کر کے کالج سے واپس جا رہے تھے۔ میرے ابو واپس جانے سے قبل مجھے کالج کینٹین پر لے گئے اور وہاں چائے

Scanned with CamScanner

اور پیسٹری وغیرہ کا آرڈر دیا۔ جب ابو کے واپس جانے کا مرحلہ آیا تو میری آنکھیں چھلک پڑیں۔ میری یہ حالت دیکھ کر میرے ابو جنہیں میں نے ہمیشہ بہت مضبوط شخص کے طور پر دیکھا تھا ان کی آنکھیں بھی چھلک پڑیں، وہ بے تاب سے ہو گئے۔ لیکن ظاہر ہے بچوں کا مستقبل والدین کے سامنے ہوتا ہے اس کے لئے اُن پر سختی بھی کی جاتی ہے اور اُنہیں خود سے دور بھی کرنا پڑتا ہے۔ وہ تھوڑی دیر کے بعد مجھے مل کر واپس چلے گئے۔ میں بھی کچھ وقت میں نارمل ہو گیا۔ پھر وہی ملٹری کالج تھا جہاں ہم نے فوجی رگڑے بھی کھائے، کراس کنٹریاں بھی کیں، تربیت کی سختیاں بھی برداشت کیں بے عزتی بھی 'رج' (بھرپور) کے کرائی۔ ویسے بھی فوجی اداروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں چائے اور بے عزتی کا کوئی خاص ٹائم نہیں ہوتا لیکن کبھی نہیں سوچا کہ ہم یہاں کیوں آئے؟ کوئی کہیں کیوں جاتا ہے؟ یہ بھی ایک تجسس ہے جسے قدرت ہی جانتی ہے بعض اوقات کوئی شخص کسی کام کے لئے بہت موزوں دکھائی دیتا ہے لیکن اُسے وہ کام نہیں ملتا اور وہ کچھ اور کر رہا ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ کرنا بھی انسان کا کام نہیں ہے۔ ایک قطرے سے بنا ہوا انسان قطرہ قطرہ قلزم بنتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان بہت کمزور اور بے بس ہے۔ طاقت ور وہی ہے اور انسان کی طاقت صرف اتنی ہی ہے جو خدائے بزرگ و برتر نے اُسے عطا کی ہوتی ہے۔ وہ خود کچھ بھی نہیں ہے۔ جب وہ وقت آ جاتا ہے تو لاکھوں کے مجمع کو لفظوں کے سحر میں جکڑ لینے والے کے لئے بسا اوقات ایک لفظ کی ادائیگی بھی محال ہو جاتی ہے۔ یہ رحمتیں، یہ برکتیں، یہ نوازشیں سب اللہ کی ہیں جو انسان کو عطا کی جاتی ہیں اور وہ خود کو ان کا مالک گردانے لگتا ہے۔ ایک دوسرے سے حسد، کدورت اور بے معنی مقابلہ بازی انسان کو کمزور کرتی ہے، بیمار، لاغر اور ذہنی طور پر اپاہج بنا دیتی ہے وہ اس سے نکل ہی نہیں سکتا اور یہی اُس کا امتحان ہوتا ہے۔ لوگ جس کو اپنے سے کم تر سمجھ رہے ہوتے ہیں کون جانتا ہے کہ وہ اندر سے کتنا مطمئن ہے، اس پر اللہ کا کتنا کرم ہے لوگ اللہ کی عنایت کی ہوئی کسی ایک طاقت، کسی ایک خوبی اور کسی دنیاوی عہدے کو دوسروں کے ساتھ موازنے میں صرف کر دیتے ہیں۔ یہ سب تو اللہ کا ہے۔ اس کا توفیق کردہ ہے۔ انسان کو ہر وقت اللہ سے مانگتے رہنا چاہئے کہ جو تو نے عطا کیا ہے وہ عطا کئے رکھنا۔ توفیق، طاقت، حوصلہ، صحت اور زندگی سب اُسی کی ودیعت ہے۔ لہٰذا والدین اپنے بچوں کے لئے صرف اچھی کوشش کر سکتے ہیں، اُنہیں اچھا نصیب یا مقدر نہیں دے سکتے۔

بہرحال ملٹری کالج کے حوالے سے ہر یاد اپنے اندر ایک داستان سموئے ہوئے ہے۔ 1983ء میں یہاں سے میٹرک کرنے کے بعد اصولاً ہم ملٹری کالج کے فارغ التحصیل کہلائے جانے لگے لیکن ملٹری کالج میں نجانے کون سی ''گیدڑ سنگھی'' تھی کہ

علاقے کی بہت بڑی شخصیت تھے، ہمارے خاندان کی جب بھی کسی سے مڈبھیڑ ہوتی تو احسن اقبال کے دادا ڈاکٹر مشتاق کے پاس جا پہنچتے اور وہ پولیس کو کہہ کر دونوں پارٹیوں میں صلح صفائی کروا دیتے

Scanned with CamScanner

مجھ سے پہلے میرا بھائی پیدا ہوا جو ایک ہفتہ تک زندہ رہنے کے بعد فوت ہو گیا، اُس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُسے نظر لگ گئی یا کسی نے تعویذ ڈال دیئے

ہم وہاں سے جانے کے بعد بھی ایم سی جے، ایم سی جے کا ورد کرتے رہے ہیں۔ سچ پوچھیے تو ہمارے پاس کوئی اور موضوع ہی نہیں ہوتا۔ گھنٹوں ملٹری کالج کی باتیں کرتے نہیں تھکتے۔ آج سے کئی برس قبل میں مئی 1980ء میں ملٹری کالج میں آٹھویں جماعت کے لئے سلیکٹ ہونے کے بعد اپنا کالا ٹرنک جس پر سفید پینٹ سے محمد یوسف لکھا ہوا تھا لے کر ابو جان کے ساتھ گیمبر چھاؤنی سے ملٹری کالج کے لئے روانہ ہوا۔ میں جس بس میں سرائے عالمگیر کے لئے سوار تھا وہ بس لالہ موسیٰ رُکی تو وہاں سے ایک اور لڑکا کالے ٹرنک اور اپنے ابو کے ساتھ اسی بس میں سوار ہوا۔ ملٹری کالج کے گیٹ پر ہم دونوں اکٹھے اُترے مجھے بعد میں معلوم ہوا وہ لڑکا عبدالحئی تھا جو اب کینیڈا میں ایک بہت بڑی کمپنی کا مالک ہے۔ ملٹری کالج میں گزرا ہوا ایک ایک پل مجھے اب بھی یاد ہے۔ شیر شاہ ہاؤس میں وارد ہوئے تو سعید راشد صاحب نے کالج نمبر الاٹ کرتے ہوئے ہمارا سواگت کچھ اس انداز میں کیا کہ ہم نے خود کو اسی وقت سے نیم لفٹین سمجھنا شروع کر دیا۔ میں افتخار ڈوم کے سامنے اسی ''نیم لفٹینی'' کے سحر میں مبتلا کھڑا تھا کہ اچانک ''بھیڑ اں من دیو'' کا نعرہ فضا میں بلند ہوا۔ میں یہ سمجھا کہ شاید ہمیں تازہ دودھ کی فراہمی کو یقینی بنانے کے لیے ملٹری کالج میں بھیڑیں پالی گئی ہیں لیکن اس ''بھیڑ چال'' کی کچھ کچھ سمجھ اس وقت آنے لگی جب شیر شاہ ہاؤس کے صحن میں دو کرسیاں لگا دی گئیں اور دو بار بر حضرات اپنی اپنی کرسی کی کمان سنبھال کر کھڑے ہو گئے۔ چونکہ میں پہلے ہی برآمدے میں کھڑا تھا، ہاؤس پریفیکٹ نے مجھے بلایا اور ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ چاچا بار بر نے اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھا تو میں اسے دست شفقت سمجھا لیکن اس نے مشین اس تیزی سے میرے سر کے اردگرد گھمائی کہ صرف وہ بال بچ سکے جو اس کے ہاتھ کے نیچے تھے۔ اس کے بعد قینچی سے باقی ماندہ بالوں کو لیول کرنا بھلا چاچے کے لیے کیا مشکل تھا۔ ہم دنبے کی سی تیزی سے چاچا حجام کے چنگل سے نکلے۔ کمرے میں جا کر آئینہ دیکھا تو محسوس ہوا کہ ہماری یہ پھرتی بھی کسی کام کی نہیں۔ چاچے نے جو کرنا تھا وہ کر چکا تھا۔ اس کے بعد ہم محتاط ہو گئے اور ہم نے فیصلہ کیا کہ یہاں ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنے کی ضرورت ہے۔

ویسے بھی چاچا حجام سے پہلے افتخار ڈوم میں میرا پالا ایک پُر جوش انسان ندیم نصیب (بعد میں میجر ریٹائرڈ) سے پڑ چکا تھا۔ جو افتخار ڈوم میں میرے ساتھ لاکر شیئر کر رہا تھا۔ میں نے ایک بیگ کو جو میرے ساتھ والے بیڈ پر رکھا تھا کو کھسکا کر دوسرے بیڈ پر رکھنا چاہا تو ایک بھاری بھرکم آواز This is my bag نے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا۔ مجھے یہ لڑکا اُس وقت 'وکھری ٹائپ' کا لگا جو بعد کی زندگی میں واقعتاً وکھری ٹائپ ہی کا نکلا ایسے خوبصورت مزاج اور فہم والے لوگ کم کم ہوتے

Scanned with CamScanner

ہیں۔ اس کے باوجود کہ وہ ہمیں اپنے ڈیسک سے Hawks کی ٹافیاں یہ کہہ کر اٹھانے سے منع کرتا تھا کہ ''بدتمیزو اس کو ٹافی مت سمجھو This is my medicine'' اور یہ میری ماما میرے لئے بھیجتی ہیں۔ اس تنبیہہ کے باوجود بھی ہمیں جب کبھی موقع ملتا اس medicine سے مستفید ہونے سے باز نہ آتے۔

شیر شاہ ہاؤس میں شام کو پہلے ہی روز ہمارا تعارفی سیشن ہوا اُس میں سب نے اپنی مرضی کے مطابق کوئی شعر، کوئی واقعہ یا کوئی لطیفہ سنایا۔ مجھے یاد ہے ارشد جاوید نے شاید پہلے ہی روز نپولین بونا پارٹ والی تقریر سُنا کر پروفیسر سعید راشد صاحب کو گرویدہ کر لیا۔ وہاں حماد احمد نے اپنا تعارف حماد احمد گھمن ولد ریاض احمد گھمن چیمہ ہسپتال ڈسکہ بتا کر ماحول کو خوشگوار بنا دیا۔ لیکن ایک کیڈٹ ساجد شکور جو آج ہم میں نہیں ہے نے ''رنگ دل کی دھڑکن بھی لاتی تو ہوگی۔ یاد میری اُن کو بھی آتی تو ہو گی'' گانا سُنا کر شیر شاہ ہاؤس کی فضاؤں کو معطر کر دیا۔ آج بھی یہ گانا لگا ہو تو ہم اُنہی یادوں میں کھو جاتے ہیں۔ ساجد شکور (بریگیڈئر ساجد شکور شہید) بھی ہمارے ساتھ افتخار ڈوم میں تھا۔ اس کی habits بہت neat تھیں۔ نمازی، دھیمی آواز میں گفتگو کرنے والا، ہنس مکھ، کبھی موڈ نہ دکھانے والا۔ شرٹ پہنتے ہوئے، ٹائی لگاتے ہوئے بھی سلیبس کی کوئی کتاب چارپائی پہ کھلی پڑی ہوتی جس پر اُس کی نظریں جمی رہتیں۔ ہم سب اپنے اپنے گھروں سے پہلی پہلی مرتبہ ہی نکلے ہوں گے۔ ساجد کو بھی پہلے ایک دو مہینے اُس کے گھر والے ملنے آئے تو شاید اُس نے کوئی دھمکی آمیز خط اپنی امی کو لکھا کہ وہ اگلے ہی ویک اینڈ پر آ گئے۔ ساجد کی والدہ نے ساجد کو افتخار ڈوم کے سامنے کھڑے دیکھا تو اُنہوں نے دور ہی سے اُسے دیکھ کر اونچی مگر دلگیر آواز اور خالصتاً پختون لہجے میں کہا 'ساجدا.....' اور ساجد گولی کی سی تیزی سے دوڑتا ہوا اُن کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ہر کام جلدی جلدی کرتا حتیٰ کہ نماز بھی جلدی سے ادا کرنے کا عادی تھا۔ چار میل کی کراس کنٹری تو وہ اور بھی جلدی میں مکمل کرتا۔ اُسے دنیا کے کاموں میں اتنی جلدی کیوں تھی اُس کا تو تب پتہ چلا جب وہ 'بھرا ہوا میلہ' چھوڑ کر اس دنیا ہی سے رخصت ہو گیا۔ جب تک ہم زندہ رہیں گے ہمیں اپنے ''سورڈ آف آنر'' (وہ..... 77ء لانگ کورس کا سورڈ آف آنر تھا) ساجد کی یادیں ہمارے ساتھ رہیں گی آج ہم اُس کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ کچھ کر سکتے ہیں تو اُس کے درجات کی بلندی کی دعا کر سکتے ہیں۔ یہ جذبے اور یہ اپنائیت ہمیں ملٹری کالج کی تربیت کی بدولت ہی حاصل ہوئی ہے۔ کراس کنٹری میں تو ہمارا ایک اور اینٹری میٹ بھی بہت دلچسپی لیتا تھا۔

ہم 9th میں تھے کہ جہلم نہر کے پُل پر کراس کنٹری کی وِسل (سیٹی) کا انتظار کرتے ہوئے اس

میں نے گیمبر چھاؤنی اوکاڑہ سے ملٹری کالج کے لئے امتحان دیا، سلیکٹ ہوا تو خوشی خوشی جا رہا تھا لیکن اس دن امی رو رہی تھیں، جس ٹانگے پر سوار ہو کر ابو کے ساتھ گیمبر بس سٹاپ کے لئے روانہ ہو رہا تھا امی کھڑی ہمیں دیکھتی رہیں

Scanned with CamScanner

ددھیال والے ذرا اکھڑ ٹائپ تھے، اب وہ اکھڑ پن نہیں رہا جبکہ ننھیال سائیڈ ذرا ڈپلومیٹک واقع ہوئی ہے

نے مجھے بتایا کہ اس مرتبہ مجھے کراس کنٹری میں فرسٹ آنا ہے تو میں نے کہا اچھی بات ہے مجھے کوئی ایشو نہیں کیونکہ میں نہ کبھی کلاس میں فرسٹ آیا تھا نہ کراس کنٹری میں، خیر! کراس کنٹری شروع ہوئی تو وہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ہماری آنکھوں کے سامنے سے اوجھل ہو گیا۔ ہم اپنے حساب سے رواں دواں تھے، ہم نے کینٹین سے خریدا ہوا Sterpsils کا پیکٹ شروع کر لیا تھا اور خراماں خراماں جا رہے تھے کہ راستے میں ایک گاؤں کے پاس سے گزرے تو 'کھالے' میں ایک کیڈٹ بے ہوش پڑا تھا اور گاؤں کی کچھ عورتیں لسی اور دودھ کے گلاس ہاتھوں میں تھامے اس کیڈٹ کو یہ کہتے ہوئے اُٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ''ایہناں فوجیاں نے منڈا مار دتا اے'' (ان فوجیوں نے لڑکا مار دیا ہے) ہم نے آگے بڑھ کر دیکھا تو ہمارا دوست کراس کنٹری سے لاتعلق لیٹا دکھائی دیا، بعد میں وہ کالج کی ایمبولینس پر کالج کے گراؤنڈ پہنچا۔ لیکن آج بھی ہمیں جب یہ واقعہ یاد آتا ہے تو میں اُس کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ ابھی صرف 9th میں ہی تھا تو اپنے سے بہت بڑے FSC والے بھائی جانز (ملٹری کالج میں سینیئرز کو بھائی جان کہا جاتا ہے) کو بھی مات دینا چاہتا تھا۔ وہ بعد میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے سے ریٹائر ہوا۔

ملٹری کالج کے ساتھ ہماری محبت کو دیکھ کر بعض لوگوں کا خیال تو یہ ہے کہ ہمیں شاید ''مالی خولیا'' ہو گیا ہے کیونکہ ہم سول ہو یا فوج ہر جگہ کسی بھی کامیاب اور باکردار آدمی کو دیکھیں تو اسے ''عالمگیرین'' سمجھنے لگتے ہیں۔ ہمیں زعم ہے کہ عالمگیرینز کے علاوہ مجوزہ خوبیاں کسی اور میں ہو ہی نہیں سکتیں۔ یہ وہی جذبہ ہے جو معروف کالم نگار عطاء الحق قاسمی کے والد مولانا بہاء الحق قاسمی کشمیریوں سے متعلق رکھتے تھے۔ وہ عطاء الحق قاسمی کے ہر دوست کو کشمیری سمجھتے تھے۔ ایک دفعہ عطاء الحق قاسمی کا ایک دوست جو کسی اور قوم سے تھا، کے بارے میں بھی ان کے والد صاحب کہنے لگے یہ لڑکا تو ہے ہی کشمیری۔ عطاء الحق قاسمی نے قسم اٹھا کر کہا کہ یہ کشمیری نہیں بلکہ کسی اور ذات کا ہے۔ اس پر ان کے والد صاحب قدرے غصے سے کہنے لگے اتنا خوبصورت لڑکا دوسری قوموں میں کہاں سے آ گیا، ہاں پھر اس کا والد کشمیری ہو گا۔

ملٹری کالج کے حوالے سے باتیں تو اتنی ہیں کہ شاید پوری ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ ہم ملٹری کالج کے شکر گزار ہیں کہ اُس نے پورے پاکستان کے مختلف جگہوں سے پھول اُٹھا کر ہمیں ایک گلدستے کا روپ دے دیا۔ جس کی خوشبو ہمیں ہمیشہ معطر رکھتی ہے اور آج کئی برس گزرنے کے بعد بھی ہمارے تعلق اتنے ہی گہرے اور مضبوط ہیں جیسے ایم سی جے میں ہوا کرتے تھے۔

استادِ محترم سعید راشد صاحب جب آرمی پبلک سکول منگلا کے پرنسپل تھے تو میں نے ان کا انٹرویو کیا جو لاہور کے ایک میگزین میں شائع ہوا۔ انٹرویو کے

Scanned with CamScanner

دوران ان کے کامیاب اور اعلیٰ عہدوں پر فائز شاگردوں کا ذکر شروع ہوا تو کہنے لگے میں تو اپنے اس سٹوڈنٹ کو بھی own کرتا ہوں جو زندگی کی دوڑ میں بظاہر پیچھے رہ گیا ہے اور گمنامی کی زندگی بسر کر رہا ہے لیکن ایک بات جو میرے لیے اطمینان کا باعث ہے وہ یہ کہ میرا سٹوڈنٹ جہاں کہیں بھی ہے، وہ اپنی جگہ ایک بھاری پتھر ہے۔ راشد صاحب کا کوئی عمل مقصد کے بغیر نہ تھا۔ ان کے عید کارڈ بھی منفرد پیغام لے کر آتے تھے۔ ان کا ایک عید کارڈ آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ اس کے ایک طرف اندھیرے میں شمع روشن تھی جبکہ دوسری جانب منیر نیازی کی ایک نظم تھی جس کا عنوان تھا ''غور سے دیکھو''!

غور سے دیکھو
آدمیوں
کے
ہجوم میں
اس
انسان کو
غور سے دیکھو
''اس کی آنکھوں
میں
کوئی بڑا مقصد ہے
اپنی عورت سے بڑا
اپنے بچے سے بڑا''

زمانہ طالب علمی کے حوالے سے مزید بتاتا چلوں کہ میں کبھی کسی سٹوڈنٹ تنظیم کا حصہ نہیں رہا۔ بلکہ جس انداز سے سٹوڈنٹس یونینز، اساتذہ اور کالج یا یونیورسٹی ایڈمنسٹریشن کو یرغمال بنا کر اپنے کام نکلواتی رہی ہیں، میں ان کا بھی سخت ناقد رہا ہوں۔ میں اسلامیہ کالج کینٹ لاہور میں سینیئر پراکٹر تھا اور این سی سی کا کمانڈر بھی تھا۔ میں نے ایک روز دیکھا کہ کالج کے بعض لڑکے صدر بازار لاہور سٹاپ سے ایک والو بس کو کالج کے اندر لے آئے۔ ڈرائیور یا کنڈیکٹر سے کسی سٹوڈنٹ کی لڑائی ہوئی ہوگی۔ میں نے دیکھا تو بہت ندامت محسوس ہوئی، میں این سی سی کی وردی میں ہی تھا، ڈرائیور گھبرایا ہوا تھا۔ والو کے اگلے حصے میں خواتین اور دیگر سواریوں سے بس بھری ہوئی تھی۔ میں سیکنڈ ایئر میں تھا اور بس کو لانے والے زیادہ تر طالب علم فرسٹ ایئر کے تھے میں نے بس کو رُکنے کا اشارہ کیا وہ رُک گئی۔ میں نے لڑکوں سے کہا یہ کیا کیا آپ لوگوں نے؟؟ آپ بس کو کالج کی بلڈنگ تک لے آئے ہو، سب لوگ کالج کا نام پڑھ رہے ہوں گے جو بدنامی کا باعث بنے گا۔ ساتھ ہی میں نے ڈرائیور سے کہا بس کو لے جائے۔ ڈرائیور میری طرف دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے اُسے دوبارہ کہا کہ لے جائیں بس کو۔ اُسے کیا چاہیے تھا، اس نے فوراً بس موڑی اور کالج کی حدود سے نکل گیا۔ اس پر لڑکے ناراض بھی ہوئے کہ یوسف بھائی یہ کیا کیا آپ نے، تو مَیں نے اُنہیں

ہمارے وہ ساتھی جن کے ساتھ ہم پی ایم اے اور کاکول کی باتیں کرتے تھے وہ ہم سے بچھڑ گئے، گویا 16 سال کی عمر ہی سے زندگی نے ایک ایسا موڑ کاٹا جس سے زندگی کا سفر کٹھن اور پُرخار ہوتا چلا گیا

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر اجمل نیازی نے پوچھا: یہ مضمون تم نے لکھا ہے؟ میں نے اثبات میں جواب دیا تو کہنے لگے یہ 'سرچشمہ' کے اس شمارے کا بہترین مضمون ہے، تم آج سے کالج میگزین کے سٹوڈنٹ مدیر ہو

سمجھا بجھا کر مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

اسی طرح پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ صحافت میں زیرِ تعلیم تھا تو ہاسٹل نمبر 9 اور پھر ہاسٹل نمبر 1 میں رہا۔ وہاں جمعیت کا ہولڈ تھا۔ میں جمعیت کا کبھی ممبر نہیں رہا لیکن ان لڑکوں سے دوستی تھی میں نے انہیں بہت اچھا پایا۔ اچھی کتابیں پڑھنے والے، اچھی گفتگو کرنے والے لڑکے تھے۔ ملک کے طول و عرض سے سٹوڈنٹس وہاں پڑھنے آتے ہیں بہت سارے صرف ''ٹورٹپے'' کے لئے کوئی سٹوڈنٹس یونین جوائن کر لیتے ہیں اور ایسے ہی طلباء خرابی کا باعث بنتے ہیں اور متعلقہ سٹوڈنٹس یونین کی بدنامی کا بھی۔ میرا پنجاب یونیورسٹی میں 91-1989ء سیشن تھا۔ ماس کمیونیکیشن ڈیپارٹمنٹ کے اُس وقت کے ناظم ہمارے ایک سال سینیئر جنید سلیم تھے۔ وہ سب سٹوڈنٹس میں مقبول تھے۔ انتہائی ڈیسنٹ اور سافٹ سپوکن۔ وہ جن دنوں اُردو نیوز کے جدہ آفس میں سب ایڈیٹر تھے، میں یہاں لاہور بیورو میں رپورٹر تھا۔ آج کل تو وہ ماشاء اللہ ایک معروف اینکر ہیں اور بہت خوبصورت پروگرام کرتے ہین۔

میں ملٹری کالج جہلم میں 1980ء میں آٹھویں میں داخل ہوا اور 1983ء میں میٹرک کیا۔ اسلامیہ کالج لاہور کینٹ میں 1983ء سے 1985ء تک پڑھتا رہا۔ سائنسز میں رجحان نہیں تھا اس لئے ایف ایس سی چھوڑ کر ایف اے کیا۔ بی اے پرائیویٹ اُمیدوار کے طور پر 1988ء میں فرسٹ ڈویژن میں کیا۔ بی اے میں میرے مضامین جرنلزم، اُردو ایڈوانس اور پنجابی تھے۔ 1989ء میں اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے اُردو کے لئے میرا نام پہلی لسٹ میں آ گیا لیکن میں نے جرنلزم کی دوسری لسٹ کا انتظار کیا جس کی دوسری لسٹ میں میرا نام میرٹ پر آ گیا اور میں نے شعبہ صحافت پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ میرا سیشن 1989ء 91ء تھا۔ لیکن ہمارا رزلٹ لیٹ آیا اور دسمبر 92ء میں میں نے ماسٹر مکمل کیا۔ رزلٹ لیٹ آنے کی وجہ ایک پرائیویٹ یونیورسٹی کی جانب سے ایم اے ماس کمیونیکیشن پرائیویٹ طور پر شروع کرنا تھا۔ جس کے خلاف پنجاب یونیورسٹی خصوصاً ماس کمیونیکیشن ڈیپارٹمنٹ کے طلباء پیش پیش تھے۔ سینیئر صحافی اور آزاد کشمیر کے سابق وزیر اطلاعات مشتاق منہاس بھی اس معاملے میں کافی متحرک تھے۔ یہ پنجاب یونیورسٹی میں میرے جونیئر تھے۔ گویا مشتاق منہاس میں قائدانہ صلاحیتیں شروع ہی سے موجود تھیں۔ یوں سٹوڈنٹس نے کافی جدو جہد کر کے یونیورسٹی انتظامیہ کو اس پرائیویٹ یونیورسٹی سے الحاق کرنے سے روکا۔

ڈاکٹر منیرالدین چغتائی ان دنوں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ جرنلزم پارٹ ون اور پارٹ ٹو کے طلباء ان کے آفس جا پہنچے اور ملاقات کے لئے اصرار کیا۔ ملاقات کا وقت نہ ملنے

Scanned with CamScanner

پر لڑکوں نے ان کے آفس کے باہر دھواں دار تقریریں کیں بالآخر انہوں نے اندر بُلایا۔ ہم لوگ اندر پہنچے تو ہمارے شعبہ کے چیئرمین ڈاکٹر مسکین حجازی صاحب پہلے سے وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھتے ہی وائس چانسلر سے کہا یہ سارے بہت اچھے بچے ہیں، اس پر وائس چانسلر نے کہا ہاں مجھے اندر آوازیں آرہی تھیں ان لوگوں کی اور جس وقت یہ میرے دروازے کو ٹھڈے مار رہے تھے اُس وقت بھی مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ کتنے اچھے بچے ہیں (خیر ٹھڈے تو شاید باقاعدہ نہیں مارے دروازے کے ساتھ پریشر پڑنے پر دروازے کی آوازیں ضرور آئی ہوں گی۔)

خیر بات کسی اور طرف نکل گئی۔ دسمبر 1992ء میں میں نے ایم اے صحافت کیا، پنجاب یونیورسٹی ہی سے 1999ء میں ایم اے اُردو بطور پرائیویٹ اُمیدوار کیا۔ 2004ء میں نمل (NUML) یونیورسٹی سے سپیشل ڈپلومہ اِن انگلش لینگویج کیا۔ 2013ء میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم فل ماس کمیونیکیشن اور جولائی 2020ء میں اوپن یونیورسٹی ہی سے ماس کمیونیکیشن میں پی ایچ ڈی مکمل کی ہے۔

بعض افراد زندگی میں اتنے اِن ہوتے ہیں کہ اُن کے آؤٹ ہونے کا گماں بھی محال دکھائی دیتا ہے۔ یہی معاملہ ڈاکٹر مسکین حجازی سے متعلق بھی ہے۔ جو اس جہانِ فانی سے رخصت ہو چکے ہیں لیکن دل ہے کہ تسلیم ہی نہیں کرتا۔ میرا 1989ء میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ صحافت میں داخلہ ہوا تو اس وقت حجازی صاحب ڈیپارٹمنٹ کے چیئرمین تھے۔ اس کے علاوہ وہ یونیورسٹی کی سطح پر تقریباً ہر ذمہ داری میں نمایاں دکھائی دیتے تھے۔ وہ سٹوڈنٹس ایڈوائزری کونسل کے چیئرمین بھی تھے جہاں اقبال خلیل انہیں معاونت فراہم کرتے تھے جبکہ ادارہ صحافت کے سابق ڈائریکٹر ڈاکٹر احسن اختر ناز مرحوم اس وقت پنجاب یونیورسٹی کے پبلک ریلیشنز آفیسر ہوا کرتے تھے۔ ڈاکٹر مسکین حجازی کی شخصیت ایسی تھی کہ ایک دو لیکچرز کے بعد ہی طلبا و طالبات ان کے گرویدہ ہو جاتے۔ وہ صحافت اور خصوصاً مسلم صحافت کی تاریخ انتہائی مزے لے لے کر پڑھایا کرتے تھے۔ ظفر علی خان کی مدبرانہ اور دلیرانہ صحافت کے کئی قصے انہیں ازبر تھے۔ ظفر علی خان کے ذیل میں دیئے گئے اشعار بھی ہم نے انہی سے سنے۔

بھارت میں بلائیں دو ہی تو ہیں
اک ساورکر اک گاندھی ہے
اک جھوٹ کا چلتا جھکڑ ہے
اک مکر کی اٹھتی آندھی ہے
لب پر ہے صدا آزادی کی
اور دل میں شوق غلامی کا
اکھڑی تھی ہوا انگریزوں کی
ان دونوں نے مل کر باندھی ہے

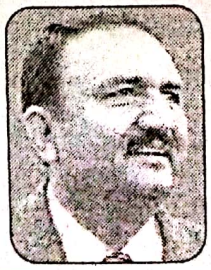

یہ میری خوش بختی رہی کہ مجھے ملٹری کالج جہلم میں پڑھنے کا موقع ملا، ملٹری کالج میں پہلے روز کالج گیٹ پر جس طرح ہمارا استقبال ہوا اور شیر شاہ ہاؤس کی جانب ریفر کیا گیا، وہ منظر آنکھوں کے سامنے ہے

Scanned with CamScanner

جب ابو کے واپس جانے کا مرحلہ آیا تو میری آنکھیں چھلک پڑیں، میری یہ حالت دیکھ کر میرے ابو جنہیں میں نے ہمیشہ بہت مضبوط شخص کے طور پر دیکھا تھا ان کی آنکھیں بھی چھلک پڑیں، وہ بے تاب سے ہو گئے

یا یوں کہیے کہ مسلم صحافت کے عناصر ثلاثہ جن میں مولانا ظفر علی خان، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد شامل تھے ان کی پسندیدہ ترین صحافتی شخصیات میں سے تھے۔ صحافت کے شعبے سے ڈاکٹر مسکین حجازی کی رغبت میں شاید کچھ حصہ ان کے سسر جناب باری علیگ مرحوم کا بھی تھا کہ جو برصغیر کے ایک معتبر اور منجھے ہوئے صحافیوں میں شمار ہوتے تھے۔ اسی طرح مولانا حسرت موہانی کے حوالے سے پڑھاتے ہوئے ان کے اشعار کا حوالہ دینا بھی ان کا اک خاصا تھا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے شعر پڑھتے ہوئے اور بھی اچھے لگتے تھے۔ حسرت کے اس شعر کا تو وہ اکثر حوالہ دیا کرتے تھے:

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

ان کی زبان سے سنے ہوئے صحافتی قصے اور چٹکلے آج ان کے نہ ہونے کے احساس کے ساتھ دل کو مغموم کرتے ہیں۔ الہ آباد (بھارت) سے شائع ہونے والے اخبار The Pioneer سے متعلق اکبر الہ آبادی کا تبصرہ جو انہوں نے سنایا آج بھی اتنے برس بیتنے کے بعد ذہنوں سے محو نہیں ہوا وہ کچھ یوں تھا۔

گھر سے خط آیا ہے کہ ہو گیا ان کا چہلم
پائنیر لکھتا ہے کہ بیمار کا حال اچھا ہے

گویا ادبی حلقوں کی جانب سے صحافتی ادارے سے متعلق اس سے بہتر انداز میں تنقید شاید نہیں ہو سکتی۔ اس شعر سے پائنیر کا کچا چٹھا اور پالیسی سامنے آ جاتی ہے۔ ڈاکٹر مسکین حجازی ارائیں برادری سے تعلق رکھتے تھے لیکن انہوں نے ایک مضبوط ارائیں ہونے کے باوجود تمام ذاتوں کے طلبا کو ہر حوالے سے اکاموڈیٹ کیا۔ کسی کے داخلے کا معاملہ ہو یا کوئی اور پھڈا، ڈاکٹر مسکین حجازی ایک شفیق باپ کی طرح ان کی مدد کے لیے موجود ہوتے تھے۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ انہوں نے مجھے اور میرے ایک کلاس فیلو ریاض الحق سندھو کو الراعی انٹرنیشنل جو آرائیں برادری کا ترجمان میگزین ہے کے ایڈیٹر چوہدری محمد حسین مرحوم کے پاس بھیجا اور کہا کہ انہیں نہ بتائیے گا کہ آپ ارائیں نہیں ہیں لہٰذا آپ لوگ اپنی پہلی جاب کے ساتھ ساتھ سیکنڈ ٹائم وہاں بھی کام کرتے رہیں یہ الگ بات ہے کہ چوہدری محمد حسین سے ہمارے مذاکرات کامیاب نہیں رہے کیونکہ وہ بغیر تنخواہ کے کام کرنے والے رضا کاروں کی تلاش میں تھے۔ لہٰذا ایک ہی نوکری پر اکتفا کرنا پڑا۔

ڈاکٹر مسکین حجازی طلبا کو اپنے بچوں کی طرح سمجھتے تھے اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے میں چنداں پیچھے نہیں رہتے تھے۔ یونیورسٹی میں داخلہ لیتے ہی میں نے ایک میگزین میں 'ایم اے اخباراں' کے عنوان سے ایک مضمون چھپوا دیا اور اس میں شعبہ صحافت میں ہونے والے داخلوں سے متعلق عدالت میں دائر رٹوں کا بھی ذکر کر دیا۔ اس کی ایک

Scanned with CamScanner

کاپی کسی طرح ڈاکٹر مسکین حجازی جو چیئرمین شعبہ صحافت تھے تک پہنچ گئی انہوں نے نائب قاصد کو بھیجا کہ یوسف عالمگیرین نام کا ہمارا کوئی نیا اسٹوڈنٹ آیا ہے اسے بلوائیں۔ میں جانے لگا تو میرے کلاس فیلو ریاض الحق نے اپنے مخصوص سٹائل میں مجھے باور کرایا کہ تم نے یہ مضمون لکھ کر خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔ ابھی تم نے دو سال اس ڈیپارٹمنٹ میں رہنا ہے اور شروع کے مہینوں میں یہ کارروائی ڈال دی ہے۔ ڈاکٹر صاحب تو شدید ناراض ہونگے۔ بہتر یہ ہے تم اِدھر اُدھر ہو جاؤ۔ ہم نے بلا سوچے سمجھے اس تجویز پر عمل کرتے ہوئے اِدھر اُدھر ہونے میں عافیت جانی۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ کلاسز ختم ہوئیں تو مجھ سمیت ہماری کلاس کے کچھ لڑکے چیئرمین شعبہ صحافت کے دفتر کے باہر سے گزر رہے تھے کہ اچانک دروازہ کھلا اور ڈاکٹر مسکین حجازی باہر نکلے۔ لڑکے انہیں دیکھ کر رک گئے ڈاکٹر صاحب سیدھے ہماری جانب آئے اور آتے ہی پوچھا آپ میں سے یوسف عالمگیرین کون ہے؟ میں نے تھوڑا تذبذب سے کام لیا تو سب لڑکوں نے بیک زبان ہو کر نشاندہی کی کہ سر یہ یوسف عالمگیرین ہے۔ میں بھی مؤدبانہ انداز میں دو قدم آگے بڑھا اور کہا سر میں ہی یوسف عالمگیرین ہوں۔ اس پر ڈاکٹر مسکین حجازی نے مجھے تھپکی دیتے ہوئے کہا کہ میں نے آپ کی ایک تحریر دیکھی ہے مجھے بہت اچھی لگی۔ آپ بہت اچھا لکھنا شروع کر دو گے۔ یہ تعریف کچھ کلاس فیلوز کو شاید زیادہ مناسب نہ لگی تو انہوں نے اس بات کو طنزیہ ہنسی میں اڑانے کی کوشش کی جس پر ڈاکٹر مسکین حجازی نے کہا بھئی میں انتہائی سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہا ہوں اور یہ بہت جلد کسی اخبار میں کالم لکھنا شروع کر دے گا۔ اس کے لیے آپ کو زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔

استاد گرامی کے منہ سے نکلی ہوئی بات یوں پوری ہوئی کہ طالب علمی کے دور ہی میں میرا کالم ''دستک'' کے نام سے روزنامہ جہاں نما لاہور اور ''لاہور میں'' کے نام سے کالم روزنامہ پاکستان لاہور کے ادبی ایڈیشن میں شائع ہونا شروع ہو گیا۔ 1993ء میں کچھ کالم 'سچی بات' کے نام سے روزنامہ نوائے وقت لاہور میں بھی شائع ہوئے۔ ذکر ہو رہا تھا ڈاکٹر مسکین حجازی کی شفقت اور سرپرستی کے وصف کا۔ تو انہوں نے سینکڑوں سیلف میڈ طلبا کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں معاونت فراہم کی۔ بعض طلبا نے ڈاکٹر صاحب پر مقالے بھی لکھے۔ سینکڑوں لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے ڈاکٹر صاحب کی ذات کو استعمال کر کے متعدد دنیاوی فوائد حاصل کیے اور پھر کام نکل جانے کے بعد کبھی مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

ڈاکٹر مسکین حجازی صحافت کے میدان میں ایک برگد کے درخت کی مانند تھے جس کی چھاؤں تلے سینکڑوں افراد نے پڑاؤ کیا، چھاؤں سے مستفید ہوئے اور اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب

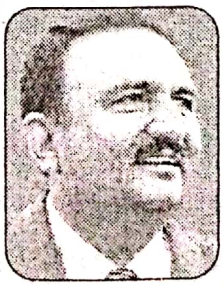

چاچا بار بر نے اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھا تو میں اسے دست شفقت سمجھا لیکن اس نے مشین اس تیزی سے میرے سر کے اردگرد گھمائی کہ صرف وہ بال بچ سکے جو اس کے ہاتھ کے نیچے تھے

Scanned with CamScanner

ملٹری کالج کے ساتھ ہماری محبت دیکھ کر بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ ہمیں شاید ''مالی خولیا'' ہوگیا ہے کیونکہ ہم سول ہو یا فوج ہر جگہ کسی بھی کامیاب اور باکردار آدمی کو دیکھیں تو اسے ''عالمگیرین'' سمجھنے لگتے ہیں

کے شاگردوں میں سابق وزیراعظم یوسف رضا گیلانی سمیت سینکڑوں نامور پاکستانی ملک وقوم کی خدمت میں مصروف عمل ہیں۔ یوسف رضا گیلانی کی صحافیوں سے انتہائی نپی تلی اور صاف صاف گفتگو سے لگتا بھی ہے کہ انہوں نے صحافت پڑھی ہوئی ہے۔ وہ تو ڈاکٹر صاحب کی رحلت پر ان کے گھر بھی گئے اور دعائے مغفرت کی۔ مختلف اخبارات و جرائد، ٹی وی چینلز اور تعلقات عامہ کے اداروں میں مختلف حیثیتوں میں کام کرنے والے سینکڑوں افراد نے ڈاکٹر مسکین حجازی سے کسبِ فیض کیا اور اب عزت و وقار سے زندگی بسر کررہے ہیں۔ اللہ ڈاکٹر مسکین حجازی کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ (آمین)

میری عملی صحافت کا آغاز شعبہ صحافت پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے ساتھ ہی شروع ہوگیا۔ پارٹ ٹائم جاب کرنا میری مجبوری تھی، لہٰذا میں نے داخلہ لینے سے قبل ہی سوچ رکھا تھا کہ میں ساتھ نوکری بھی کروں گا۔ ہیڈ مرالہ میں میرے ایک صحافی دوست طاہر منیر طاہر نے مجھے پروین ملک صاحبہ جو اُن دنوں ''پاک جمہوریت'' اخبار کی ایڈیٹر تھیں کے نام ایک رقعہ دیا کہ پارٹ ٹائم کے لئے ان کی مدد کریں۔ میں بھی پاک جمہوریت میں چھوٹے چھوٹے مضامین لکھا کرتا تھا لیکن پروین ملک صاحبہ سے میری براہِ راست ملاقات نہیں تھی۔ وہ بطور رائٹر مجھے جانتی تھیں۔ میں اُن سے ملا اور رقعہ دیا تو وہ خوش ہوئیں کہ آپ کا داخلہ شعبہ صحافت میں ہوگیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے بھی ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز اسی ڈیپارٹمنٹ سے کیا تھا۔ انہوں نے فوراً مجھے ایک رقعہ ڈاکٹر مہدی حسن صاحب کے نام لکھ کر دیا جو شعبہ ماس کمیونیکیشن میں پڑھاتے تھے۔ اس میں انہوں نے لکھا کہ یہ سٹوڈنٹ ''پاک جمہوریت'' کا مضمون نگار ہے اسے کہیں جاب بھی کرنی ہے۔ لہٰذا اس کی معاونت فرمائیں۔ ڈاکٹر مہدی حسن صاحب نے خوشی کا اظہار کیا اور مدد کا وعدہ فرمایا۔

میرا یونیورسٹی میں داخلہ ہوا تو میں کلاس کے بعد کبھی کبھی ڈاکٹر اجمل نیازی کے ہاں وحدت کالونی میں واقع ان کے گھر چلا جاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ شفقت سے ملا کرتے تھے۔ جب داخلے کے بعد پہلی مرتبہ ان سے ملنے گیا تو میں نے بتایا کہ میرا ماس کمیونیکیشن ڈیپارٹمنٹ میں داخلہ ہوگیا ہے تو وہ خوش ہوئے اور کہا کہ توفیق بٹ ہمارا ایک دوست ہے اس کا داخلہ بھی وہاں ہوا ہے۔ بعد میں میرا لاہور کا زیادہ وقت عزیز دوست توفیق بٹ کے ساتھ ہی گزرا اور ادبی سرگرمیوں میں ایک ساتھ آنا جانا شروع ہوئے۔ توفیق بٹ کا گھر لاہور میں میرے اپنے گھر جیسا تھا۔ سید مٹھا بازار میں اُن کا آبائی گھر اور پھر حبیب اللہ روڈ پر نئے گھر میں زیادہ وقت گزرتا۔ توفیق کے والد اور والدہ بہت ڈیسنٹ اور شفقت برتنے والے تھے۔ بٹ کے والد کا اچھا خاصا بزنس تھا لیکن تصنع ان میں نام کو نہیں تھا۔ بہت

Scanned with CamScanner

صابر وشاکر انسان تھے۔ اللہ دونوں کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔

بہر کیف میں نے ڈاکٹر اجمل نیازی صاحب سے پوچھا سر The Nation اخبار میں کوئی واقف ہے تو کسی سے بات کریں میں وہاں کام کرنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً پوچھا ''توں اوتھے کیہ کریں گا؟'' (تم وہاں کیا کرو گے) میں نے کہا ''سر جو باقی کردے نیں۔'' (جو باقی کرتے ہیں) اس پر وہ میری طرف دیکھ کر ہنس پڑے، کہنے لگے بڑا شریر ایں یار توں۔ پھر انہوں نے خود ہی کہا کہ ہوسکتا ہے وہ ایم اے مکمل کرنے سے پہلے نہ رکھیں۔ میں اس طرح کرتا ہوں کہ طارق فاروق سے بات کرتا ہوں وہ ہمارے دوست ہیں اور بیڈن روڈ لاہور سے روز نامہ جہاں نما کے نام سے ایک اخبار شروع کر رہے ہیں۔ اُن دنوں جہاں نما ہفت روزے کے طور پر شائع ہو رہا تھا۔ طارق فاروق صاحب برادرم توفیق بٹ کے بھی دوست تھے۔ انہوں بھی طارق فاروق سے کہا۔ یوں میں جنوری / فروری 1990ء میں ہفت روزہ جہاں نما کے آفس میں جانا شروع ہوگیا۔ ان دنوں ایک دھما کہ ہوا تھا بھاٹی دروازے میں تو مجھے طارق فاروق صاحب نے کہا کہ اس دھماکے پر ایک تجزیہ لکھیں میرا تراہ نکل گیا کہ یہ کیا کام دے دیا گیا۔ خیر میں نے اُس پر ایک مضمون لکھ دیا۔ طارق صاحب نے اُسے ہفت روزہ جہاں نما کے ٹائٹل کے طور پر شائع کیا۔ یوں وہ مضمون میرا کسی بھی اخبار یا رسالے کے لئے کسی کرنٹ افیئر زیا قومی ایشو پر پہلا مضمون تھا۔

اپریل 1990ء میں جہاں نما روزنامے کے طور پر شروع ہوا تو طارق فاروق صاحب کے بعد میں آل اِن آل تھا، سب ایڈیٹر، نیوز ایڈیٹر، سب کچھ میں تھا۔ شروع کے چند دن خورشید الزمان خوشحالی صاحب کو بُلایا گیا وہ بڑے زبردست انسان تھے۔ انہوں نے آتے ہی مجھے بتادیا کہ طارق فاروق صاحب کی خواہش ہے کہ میں زیادہ وقت کے لئے یہاں کام کروں مگر میں نے ادھر زیادہ نہیں رُکنا یہ سب آپ ہی نے کرنا ہے اور آپ آسانی سے کرلیں گے۔ یوں خورشید الزمان خوشحالی صاحب عملی صحافت میں میرے پہلے اُستاد کے طور پر سامنے آئے۔ چند دنوں بعد میں نیوز ایڈیٹر، شفٹ ایڈیٹر سب کچھ تھا۔ کلر ایڈیشن بھی میں ہی تیار کرواتا، ادارتی صفحہ بھی میری نگرانی میں تیار ہوتا۔ PPI سے انگریزی کریڈ آتی تو اُس کا ترجمہ اور خبریں بنانا بھی میری ذمہ داری تھی۔

معروف صحافی علی جاوید نقوی نے جہاں نما کو بطور کالم نویس جوائن کیا اور ٹی وی مانیٹرنگ بھی وہ دیکھتے تھے۔ ایک آدھ ٹرینی سب ایڈیٹر بھی ہمارے ساتھ تھا اور خوش نویسوں کی ایک پوری ٹیم جو گوڈے پر مستر رکھ کر قلم دوات کے ساتھ خبریں لکھتے۔ بہت محنت طلب کام تھا ان کا۔ حکیم یوسف عزیز صاحب

ماس کمیونیکیشن ڈیپارٹمنٹ کے اُس وقت کے ناظم ہمارے ایک سال سینیئر جنید سلیم تھے، وہ سب سٹوڈنٹس میں مقبول تھے، انتہائی ڈیسنٹ اور سافٹ سپوکن، آج کل تو وہ ماشاءاللہ ایک معروف اینکر ہیں اور بہت خوبصورت پروگرام کرتے ہیں

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر حجازی نے کہا: یہ ''سارے بہت اچھے بچے ہیں''، اس پر وائس چانسلر نے کہا ہاں مجھے اندر آوازیں آ رہی تھیں ان لوگوں کی اور جس وقت یہ میرے دروازے کو ٹھڈے مار رہے تھے اُس وقت بھی مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ کتنے اچھے بچے ہیں!

صرف لیڈ اور دیگر سرخیاں لکھنے کے لئے شام کو آیا کرتے تھے۔ میں نے کچھ عرصہ یہ کام کیا تو مجھے لگا کہ یونیورسٹی سے غیر حاضریاں بہت بڑھ گئی ہیں تو میں نے کلاسز کی جانب توجہ دی اور جہاں نما سے چند چھٹیاں کر لیں۔ اسی دوران معروف صحافی سعید اختر کو جہاں نما کی نیوز ایڈیٹر کی ذمہ داریاں دی گئیں اور میں نے طارق صاحب سے بات کی کہ میں 3 بجے تک پہنچ جایا کروں گا تو انہوں نے کہا اس طرح سے روزانہ کاپی لیٹ ہو جایا کرے گی۔ آپ دو بجے تک آ جایا کریں پھر اُس کا حل میں نے یہ نکالا کہ میں ڈیپارٹمنٹ کا آخری پیریڈ مس کرتا اور اپنی کتابیں کسی ہوسٹل فیلو کے حوالے کر کے ایک بجے والی یونیورسٹی بس پکڑ لیتا۔ کبھی چیئرنگ کراس اور کبھی ریگل چوک اتر جاتا وہاں سے پیدل بیڈن روڈ روزنامہ جہاں نما پہنچتا اور کام شروع کر دیتا۔ وہاں سعید اختر اور میں ہر حوالے سے سارے کام سنبھالے ہوئے تھے۔ بعد میں جمشید بٹ بطور سب ایڈیٹر آ گئے اب وہ ماشاء اللہ ایک منجھے ہوئے ایڈیٹر ہیں۔

سعید اختر بھی کہنہ مشق صحافیوں میں سے ایک ہیں۔ ہمارے ساتھ والے کیبن میں وسیم گوہر مرحوم ایڈیٹر ''پلک'' تھے اور مرزا شعیب ڈپٹی ایڈیٹر تھے۔ ثاقب بخاری فوٹو گرافر تھے وہ ماہنامہ پلک اور جہاں نما کے لئے کام کرتے تھے۔ یامین صدیقی بھی جہاں نما کے ساتھ منسلک رہے۔ معروف صحافی شعیب بھٹہ بطور رپورٹر جہاں نما کے ساتھ کچھ عرصہ منسلک رہے۔ مجھے جہاں نما سے پارٹ ٹائم کام کرنے کے ایک ہزار روپے ملا کرتے تھے۔ ان دنوں دیگر اخبار بھی تقریباً 15 سو روپے تک ہی تنخواہ دیا کرتے تھے۔ میری کالم نگاری کا دور بھی جہاں نما ہی میں 1990ء ہی میں شروع ہو گیا اور ''دستک'' کے نام سے میرے کالم شائع ہونا شروع ہوئے۔ میرے اور علی جاوید نقوی کے کالم صفحہ 2 پر آمنے سامنے شائع ہوا کرتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب کالم اور اداریہ 'دانے دار' لکھوایا جاتا اور دانے دار لکھنے والا بہت منجھا ہوا خوش نویس گردانا جاتا۔

اللہ نے ہمیشہ اور ہر موڑ پر مجھے کامیاب کیا۔ میں پارٹ ٹائم کام کرتا رہا۔ کچھ نہ کچھ سیکھتا رہا اور تجربہ حاصل ہوتا رہا۔ گزارہ بھی چلتا رہا۔ کچھ پیسے گاؤں جاتا تو امی دے دیتیں، باقی میں جہاں نما سے ملنے والے پیسوں سے گزارہ کرتا۔ جہاں نما میرے لئے سب کچھ ہی تھا۔ یونیورسٹی سے فارغ ہوا تو طارق فاروق صاحب نے بالائی منزل پر ایک کمرہ میرے حوالے کر دیا۔ طارق صاحب اس کمرے کو ذرا سیٹ کر کے میرے حوالے کرنا چاہتے تھے لیکن توفیق بٹ اپنی کالے رنگ کی خیبر گاڑی پر مجھے ایک نمبر ہاسٹل لینے آ گئے۔ میرا سامان گاڑی میں رکھا اور بیڈن روڈ جا پہنچے جس پر طارق بھائی جان نے کمرہ جہاں ہے، جیسے ہے کی بنیاد پر میرے حوالے کر دیا۔ طارق فاروق اور بھابی نازلی طارق

Scanned with CamScanner

فاروق اللہ کے کوئی خاص لوگ تھے۔ لوگوں کے لئے خیر کثیر۔ صاف نیت والے لوگ تھے۔ طارق فاروق صاحب کو ہم سب بھائی جان طارق کہتے تھے۔ وہ جہاں نما اخبار کے مالک تھے لیکن وہ کوئی روایتی باس نہیں تھے۔ سب سے اچھا برتاؤ کرتے۔ وہ علاج بالغذا پر یقین رکھتے تھے۔ شاید اسی لئے ان کے گھر میں اچھی غذا بنتی۔ ان کا گھر توفیق بٹ کے لئے اپنے گھر جیسا تھا۔ میں اور توفیق بٹ اکثر 37 لکشمی مینشن میں طارق بھائی جان کے گھر ہی پائے جاتے۔ یہ گھر انہوں نے قدرت اللہ شہاب کے بیٹے سے خریدا تھا۔ اب طارق بھائی جان بھی نہیں ہیں اور بھابھی نازلی طارق بھی نہیں رہیں۔ اللہ اُن کے درجات بلند فرمائے۔ کیا خوبصورت جوڑی اللہ نے بنا کر دنیا میں بھیجی تھی!

بہرکیف اپریل 1993ء میں 'سچی بات' کے نام سے نوائے وقت لاہور میں کچھ کالم شائع ہوئے۔ میں نے ایک کالم لکھا ''صدر نے ڈنڈی ماری ہے'' جو بزرگ سیاستدان نوابزادہ نصراللہ خان کے ایک بیان کو بنیاد بنا کر لکھا گیا۔ انہیں وہ تنقید پسند نہ آئی تو انہوں نے جناب مجید نظامی کو فون کر دیا۔ انہوں نے چیک کروایا کہ یہ کون نو وارد کالم نگار ہے جو نوابزادہ صاحب ہی کو پڑ گیا ہے، اسے تھوڑا گیپ دیں۔ یوں میرے کالم ''سر منڈاتے ہی اولے پڑے'' کے مصداق تعطل کا شکار ہو گئے۔ میرا کالم شائع ہونے کے تیسرے دن نوائے وقت میں نوابزادہ صاحب کی جانب سے ایک تین کالمی خبر بھی شائع ہوئی کہ بعض کالم نگار میرے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پھر جب میں 1998ء سے دو ہزار کے دوران اردو نیوز کا رپورٹر تھا تو میں کئی دفعہ فون کر کے یا کبھی کبھار فون کے بغیر بھی لاہور ریلوے سٹیشن کے قریب واقع نوابزادہ صاحب کے پاکستان جمہوری پارٹی والے دفتر (نکلسن روڈ) جایا کرتا تھا اور کسی ایشو پر اُن کا بیان یا مؤقف لینے کے لئے تو وہ ہمیشہ انتہائی وضع داری اور شفقت سے ملتے۔

نوائے وقت میں کالم نگاری شروع کرنے کے لئے میں اس وقت کے ڈپٹی ایڈیٹر اسداللہ غالب سے ملا۔ اُنہیں کالم دیا اُنہیں پسند آیا اور انہوں نے بغیر کسی سفارش کے مجھے کالم لکھنے کا موقع دیا جس پر میرے دل میں اُن کے لئے ہمیشہ احترام کا جذبہ رہا۔ وگرنہ بہت سے لوگ کسی میں ذرا سا ٹیلنٹ دیکھ لیں تو اُس کی راہ میں روڑے اٹکانا شروع کر دیتے ہیں۔ مجھے یاد ہے جب ہماری کلاس کا وائیوا ہوا تو اسداللہ غالب صاحب سبجیکٹ پروفیشنل کے طور پر چیئرمین ڈاکٹر مسکین حجازی کے کمرے میں موجود تھے اور سوالات کر رہے تھے۔ میں اندر داخل ہوا تو ڈاکٹر مسکین حجازی نے کہا یہ ہمارے ڈیپارٹمنٹ کا سب سے اچھا لڑکا ہے، بہت اچھا لکھتا ہے۔ یہ مستقبل کا عطاء الحق قاسمی ہے۔ اس پر اسداللہ غالب نے شگفتہ انداز میں کہا پہلے والے

ڈاکٹر مسکین حجازی کی شخصیت ایسی تھی کہ ایک دو لیکچرز کے بعد ہی طلبا و طالبات ان کے گرویدہ ہو جاتے، وہ صحافت اور خصوصاً مسلم صحافت کی تاریخ انتہائی مزے لے لے کر پڑھایا کرتے تھے

Scanned with CamScanner

میں دو قدم آگے بڑھا اور کہا سر میں ہی یوسف عالمگیرین ہوں، اس پر ڈاکٹر مسکین حجازی نے مجھے تھپکی دیتے ہوئے کہا، میں نے آپ کی ایک تحریر دیکھی ہے مجھے بہت اچھی لگی، آپ بہت اچھا لکھنا شروع کر دو گے

عطاء الحق قاسمی صاحب کا کیا کریں گے؟ ظاہر ہے یہ ایک جملہ معترضہ تھا جو انہوں نے کہا۔ ان سمیت سبھی لوگ جناب عطاء الحق قاسمی کے کام اور نام کے معترف ہیں۔

جب میں نے ہوش سنبھالا تو لکھنے پڑھنے کی جانب ایک رغبت محسوس کی۔ جب پانچویں جماعت میں مڈل سکول ڈیلرہ میں تھا تو میں نے ایک کاپی پر مختلف شاعروں کے شعر درج کر رکھے تھے۔ میں اپنی کولیکشن دوستوں کو پڑھ کر سناتا تو وہ حیران رہ جاتے۔ اس سے بھی قبل مجھے قلم جمع کرنے کا شوق تھا۔ آٹھویں جماعت میں ملٹری کالج میں داخلہ لیا تو وہاں پروفیسر سعید راشد ایسے مصنفین اور محققین سے فیض حاصل کیا۔ انہوں نے شیر شاہ ہاؤس کی لائبریری کو بالکل اوپن رکھا ہوا تھا۔ اس لائبریری کو 24 گھنٹوں میں ایک لمحے کے لئے بھی تالا نہیں لگتا تھا وہی سعید راشد صاحب کا آفس بھی تھا۔ کوئی کیڈٹ کسی بھی وقت اس لائبریری میں جا کر استفادہ کر سکتا تھا۔ کوئی بھی کتاب اُٹھا کر کمرے میں لے جا سکتا تھا۔ حتیٰ کہ چھٹیوں میں اپنے ساتھ گھر بھی لے جائے تو کوئی نہیں پوچھتا تھا، راشد صاحب سے کسی نے پوچھا کہ اس طرح کتابیں بچے واپس نہیں بھی کرتے ہوں گے تو راشد صاحب نے کہا لیکن اس طرح بہت مہنگی مہنگی کتابیں اس لائبریری کا حصہ بھی بن جاتی ہیں اور مجھے معلوم نہیں ہوتا کہ یہاں کون رکھ گیا ہے۔ اسی طرح سہ پہر میں ریسٹ ٹائم ہوتا یا جب شام کو سٹڈی ٹائم ہوتا تب بھی کیڈٹس کو اجازت تھی کہ وہ اس لائبریری میں جائیں اور کتابیں لے کر پڑھ سکتے ہیں۔ سو ایسے ماحول میں ہلکا پھلکا لکھنے کی کوشش کی۔ میں نے ایک دو مزاحیہ نظمیں لکھیں وہ راشد صاحب کو دکھائیں تو وہ بہت خوش ہوئے۔ وہاں سے میٹرک کر کے فارغ ہوئے تو اسلامیہ کالج کینٹ کے مجلّے 'سرچشمہ' کے لئے باقاعدہ طنز و مزاح پر مبنی ایک تحریر ''کینٹ کالج کی سیر'' لکھی جس پر ڈاکٹر اجمل نیازی صاحب نے مجھے اس کا سٹوڈنٹ معاون مدیر مقرر کیا۔

میں نے باقاعدہ شاعری فرسٹ ایئر میں شروع کر دی تھی۔ ڈاکٹر اجمل نیازی صاحب کو دکھائی تو انہوں نے کہا تم نثری نظم اچھی لکھتے ہو۔ ایسا کرو تم محترمہ کشور ناہید صاحبہ سے ملو وہ اُن دنوں لاہور میں پاکستان نیشنل سینٹر کی ڈائریکٹر تھیں۔ انہیں شاعری دکھائی تو انہوں نے بھی کہا خود کو نثری نظموں کے ذریعے ایکسپریس کرو۔ میں نے نثری نظمیں بھی زیادہ نہیں لکھیں پنجابی شاعری کی طرف رجحان زیادہ تھا انٹر کے فوراً بعد ہی پنجابی غزلیں اور منفرد اشعار کہنے شروع کئے میری پہلی پنجابی غزل کا ایک شعر

شہر دے لوکی لڑ لڑ مر گئے، کتھے گئے سیانے لوک
اوکھے ویلے کم نہ آئے، جانے تے پہچانے لوک

غیر سرکاری اور پرائیویٹ ملازمت تو میں نے پڑھائی کے ساتھ ساتھ ہی شروع کر دی تھی۔ لاہور

Scanned with CamScanner

آر اے بازار کے قریب جہاں والد صاحب کو سرکاری گھر ملا ہوا تھا اس کے بالکل ساتھ ایک آرٹلری یونٹ تھی وہاں ایک لڑکا الیاس اپنے بھائی کے پاس جو ''ایجوکیشن جے سی او'' تھے، رہ کر بی کام کر رہا تھا۔ وہ اُس یونٹ میں سول ٹیچر کے طور پر جو غیر تعلیم یافتہ فوجی جوانوں کے لئے ایجوکیشن کلاسز چلتی تھیں انہیں پڑھاتا تھا۔ ان کا سلیبس بہت بنیادی اور مڈل کی سطح تک کا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ 14 سو روپے ماہانہ ملتے ہیں۔ صرف چند کلاسز پڑھانا ہوتی ہیں۔ انہیں ایک اور میٹرک پاس ٹیچر کی ضرورت ہے تو اُس نے مجھے وہ کلاسز دلوا دیں، میں نے اُس وقت انٹر کیا ہوا تھا۔ میں بھی دو چار پیریڈ پڑھاتا اور باقی وقت بی اے کی تیاری کرتا۔

اسی دوران 1987ء میں میرے والد صاحب ریٹائر ہو کر گاؤں شفٹ ہو گئے۔ میں نے لاہور ہی میں رہتے ہوئے بی اے کے پیپر دیئے اور فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ بعد میں 1989ء میں شعبہ صحافت پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ اس طرح سے یہ ٹیچنگ میری زندگی کی پہلی جاب ثابت ہوئی۔ دوسری جاب 1990ء میں روزنامہ جہاں نما کی تھی جو ایک پرائیویٹ جاب تھی۔ جہاں نما سے پہلے گلبرگ لاہور میں سید شایان کی ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں دو چار دن کام کیا۔ وہاں موٹر سائیکل کی ضرورت تھی جو میرے پاس نہیں تھی۔ سو میں نے جاب چھوڑ دی۔ مشقِ سخن جاری رکھی اور چکی کی مشقت بھی کے مصداق کام بھی کرتا رہا اور پڑھتا بھی رہا۔

پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے کرتے ہوئے ساتھ پارٹ ٹائم جاب کرنے کا اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ فائدہ دیا کہ جب میرا ایم اے مکمل ہوا تو ساتھ ہی دو سال کا عملی صحافت کا تجربہ بھی حاصل کر لیا۔ 1993ء کے اوائل میں اخبار میں ایک اشتہار آیا جو کہ گورنمنٹ آف پنجاب کے تحت ایشیائی ترقیاتی بینک کا ایک پراجیکٹ تھا۔ لائیو سٹاک پروڈکشن ایکسٹینشن پراجیکٹ نامی اس پراجیکٹ میں آڈیو ویژول آفیسرز درکار تھے۔ جو ایم اے صحافت اور دو سالہ عملی تجربہ رکھتے ہوں۔ اسی دوران معین قریشی نگران وزیراعظم بن چکے تھے۔ سیاسی دباؤ اور سفارش کا کلچر کم ہو چکا تھا۔ میں نے گریڈ 17 کی اس ویکنسی پر اپلائی کیا اور میرٹ پر سلیکشن ہو گئی یوں میں نے دسمبر 92ء میں ایم اے کیا تھا تو 8 مئی 1993ء کو میں گورنمنٹ آف پنجاب میں گریڈ 17 کا آفیسر بننے میں کامیاب ہو گیا۔ ایشین بینک کے معاہدے کے تحت اس پراجیکٹ کو پانچ سال بعد ریگولر ڈائریکٹوریٹ میں تبدیل ہونا تھا لیکن دسمبر 1997ء میں جب اس کو پانچ سال ہوئے تو بجائے اس کو ریگولرائز کرنے کے یکسر بند کر دیا گیا۔ یوں میں تقریباً 5 سال سرکاری نوکری کے بعد بے روزگار ہو گیا۔ اس دوران میں سی ایس ایس کے پرچے دے رہا تھا۔ جس میں ایک دو مضامین میں ناکام ہوا

ڈاکٹر مسکین حجازی نے کہا یہ ہمارے ڈیپارٹمنٹ کا سب سے اچھا لڑکا ہے، بہت اچھا لکھتا ہے، یہ مستقبل کا عطاء الحق قاسمی ہے، اس پر اسد اللہ غالب نے شگفتہ انداز میں کہا پہلے والے عطاء الحق قاسمی صاحب کا کیا کریں گے؟

Scanned with CamScanner

عموماً نظامی صاحب جاب کے سلسلے میں ملنے والوں کو ٹیسٹ کے لیے نیوز روم بھجوادیا کرتے تھے لیکن مجھے انہوں نے ٹیسٹ سے متعلق کچھ نہیں کہا اور کہا کہ ارشاد عارف آجائیں تو اُن سے مشورہ کرلیں گے

اب سرکاری نوکری بھی نہ رہی کہ میں اپنا اگلا چانس avail کرسکتا۔ اوورایج ہونے کی وجہ سے آئندہ کوئی ٹرائی نہ کرسکا۔ 98 میں میں نے اردو نیوز جدہ جوائن کرلیا۔ اُردو نیوز جدہ جوائن کرنے سے قبل میں نوائے وقت کے چیف ایڈیٹر مجید نظامی صاحب سے ملا۔ میں نے نظامی صاحب سے کہا میں نوائے وقت میں کام کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے میرے کالم اور تحریریں نوائے وقت میں شائع ہوتی رہیں۔ انہوں نے میرا سی وی اور جو کالم ساتھ لف تھے، دیکھے اور کہا آج ڈپٹی ایڈیٹر ارشاد عارف صاحب چھٹی پر ہیں، وہ کل آئیں گے تو اُن سے مشورہ کریں گے کہ آپ کو کس شعبے میں رکھنا ہے۔ عموماً نظامی صاحب جاب کے سلسلے میں ملنے والوں کو نیوز روم بھجوادیا کرتے تھے تاکہ اُن کا ٹیسٹ وغیرہ لیا جاسکے لیکن مجھے انہوں نے ٹیسٹ سے متعلق کچھ نہیں کہا اور کہا کہ ارشاد عارف آجائیں تو اُن سے مشورہ کرلیں گے۔

میں نے دو تین دِن انتظار کیا اور سوچا کہ نوائے وقت جا کر چیک کرلیتا ہوں کہ کیا اَپ ڈیٹ ہے میں شعبہ صحافت نیو کیمپس میں گھوم رہا تھا، باہر نکلا تو میرے اُستاد ڈاکٹر اے آر خالد صاحب ملے، پوچھا کہاں کی تیاری ہے؟ میں نے کہا سر نوائے وقت جارہا ہوں کہنے لگے، آئیں میرے ساتھ میں بھی نوائے وقت جارہا ہوں۔ میں اُن کے ساتھ اُن کی سفید رنگ کی مہران گاڑی میں بیٹھ گیا۔ انہوں نے اپنا کالم بھی وہاں دینا تھا۔ راستے میں میں نے اُنہیں بتایا کہ مجید نظامی صاحب سے اس بابت ملا تھا۔ وہ مجھے لے کر سیدھا ڈپٹی ایڈیٹر ارشاد عارف کے کمرے میں گئے۔ ہم جا کر بیٹھ گئے، ڈاکٹر صاحب نے کہا ارشاد صاحب، یوسف عالمگیرین دو تین دن قبل نظامی صاحب سے ملا تھا۔ اس کا کیا فیصلہ ہوا؟ ارشاد عارف صاحب نے پہلے تو نفی میں جواب دیا کہ مجھے ان کے سی وی کا پتہ ہی نہیں۔ پھر انہوں نے مجھے پوچھا آپ کو راولپنڈی نوائے وقت میں سب ایڈیٹر کے طور پر بھیج دیں تو آپ کا کیا خیال ہے؟ میں نے کہا کوشش کریں کہ لاہور میں ایڈجسٹ ہوجاؤں۔ پھر کہنے لگے ملتان نوائے وقت میں بھی ایک سیٹ ہے وہاں بھیج دیں؟ میں نے اس کے لئے بھی نفی میں جواب دیا تو ڈاکٹر اے آر خالد کہنے لگے ''یار ارشاد عارف اینج نہ کر، نظامی صاحب توں چیک کر کے ویکھو کیہ صورت حال بن سکدی اے؟'' مجھے آج بھی کبھی ڈاکٹر اے آر خالد صاحب کا میرے لئے Concern یاد آتا ہے تو اُن کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے کہ آپ کے اساتذہ اور ویل وشرز کس طرح آپ کے لئے کاوش کررہے ہوتے ہیں۔

اسی طرح پروفیسر شفیق جالندھری صاحب مجھے نوائے وقت آفس کے باہر مل گئے، کہنے لگے کدھر؟ میں نے ماجرا بیان کیا تو انہوں نے میرا بازو پکڑا اور مجھے شاہراہِ فاطمہ جناح پر واقع روزنامہ چٹان کے

Scanned with CamScanner

دفتر میں چیف ایڈیٹر مسعود شورش (آغا شورش کاشمیری صاحب کے فرزند) کے پاس لے گئے کہ آپ ہفت روزہ چٹان سے روزنامہ چٹان شروع کر رہے ہیں تو یوسف عالمگیرین بھی ادھر ہی آپ کے پاس کام کرے گا۔ مسعود شورش صاحب کی سب سے چھوٹی بہن بھی ہمارے ساتھ شعبہ صحافت میں کلاس فیلو تھیں۔ میں بہر طور نوائے وقت میں دلچسپی رکھتا تھا۔ پھر بھی میں نے سوچا چند دن تک جب تک فیصلہ نہیں ہو جاتا چٹان جانا شروع کرتا ہوں۔ میں شاید ایک آدھ ہفتہ چٹان جاتا رہا۔ احمد شجاع پاشا وہاں نیوز ایڈیٹر تھے لیکن میرے ہوتے ہوئے ہی وہ چھوڑ کر چلے گئے۔ میں وہاں چند دن ہی گیا کہ مجھے نصر اللہ غلزئی صاحب بیورو چیف اردو نیوز جدہ کی کال آ گئی کہ آپ کا سی وی جدہ آفس بھیجا ہوا تھا آپ کام شروع کریں۔ وہاں سے اپروول ایک آدھ دن میں آ جائے گی۔ یہ وہ وقت تھا جب خالد منہاس اُردو نیوز لاہور بیورو سے جدہ جا چکے تھے۔ جناب رؤف طاہر مرحوم بھی جدہ روانہ ہونے والے تھے۔ میرا سی وی انہوں نے ہی نصر اللہ غلزئی صاحب کو دیا تھا۔

بہر حال میں اُردو نیوز میں جاب کر رہا تھا تو 99 کے اوائل میں میرا دوست اشرف شریف ایک اشتہار میرے پاس لے کر آیا کہ یار ایک ویکنسی آئی ہے، تم اپلائی کرو تم ہو جاؤ گے۔ یہ انفارمیشن آفیسر (BS-17) کی آسامی تھی، خیر میں نے اپلائی کر دیا۔ پاکستان کے مختلف شہروں میں تحریری امتحان ہوا۔ سینٹرل ماڈل سکول لاہور سینٹر بنا وہاں بھی کوئی ساٹھ اُمیدوار ہوں گے جنہوں نے امتحان دیا۔ اس میں ایم اے انگریزی، انٹرنیشنل ریلیشنز اور جرنلزم سمیت دیگر ماسٹرز ڈگری ہولڈر اُمیدوار تھے۔ انٹرویوز بھی شاید اسلام آباد، لاہور اور کراچی کے اسٹیشنز پر ہوئے۔ میں لاہور سے تھا سو فیڈرل پبلک سروس کمیشن لاہور کے آفس میں انٹرویو ہوا، کوئی 9، 10 امیدوار وہاں بھی تھے انٹرویو کے لئے بریگیڈیئر راشد قریشی (بعد میں میجر جنرل) انٹرویو کے لئے بطور ڈیپارٹمنٹل ریپرزینٹیٹو پینل میں موجود تھے۔ بورڈ کے پریذیڈنٹ ایف پی ایس سی کے کوئی سینئر ممبر تھے۔ بہر حال شاید 25 نومبر 1999ء کو مجھے دوست ناصر محمود کی کال آئی کہ تمہاری آئی ایس پی آر کے لئے سلیکشن ہو گئی ہے اور ایف پی ایس سی کی کال آئی ہے۔ میں چونکہ کبھی لاہور میں اور کبھی سیالکوٹ میں چکر لگا رہا ہوتا تھا تو میں نے ایڈریس کسی ایسے دوست کا دیا ہوتا تھا جو مستقل لاہور کا رہائشی ہو۔ پنجاب گورنمنٹ میں سلیکشن کا لیٹر مجھے کلاس فیلو اور دوست توفیق بٹ کے ایڈریس پر موصول ہوا تھا۔

23 نومبر 1999ء کو میرا اپائنمنٹ لیٹر اس دن سائین ہوا جس دن میری بڑی بیٹی کی گنگا رام ہسپتال میں پیدائش ہوئی۔ ان دنوں گنگا رام ہسپتال کی انچارج ڈاکٹر راشدہ یاسمین تھی جو بہت متحرک

میں نے کبھی دولت کے لئے بیرونِ ملک جانے کا نہیں سوچا
میں نے ہمیشہ اپنے ملک میں رہ کر اپنا کردار ادا کرنے کا سوچا اور
اسی مٹی سے جڑے رہتے ہوئے آگے بڑھنے کا خواہاں رہا

Scanned with CamScanner

انگریز مہمان نے میرے کولیگز کی موجودگی میں مجھے پوچھا، میری بیٹی چھٹیوں کے دوران میری فیملی کے ہمراہ پاکستان آ رہی ہے کیا آپ اُس سے شادی کرو گے؟ میں نے فوراً کہا Thanks, I am already engaged

اور باہمت خاتون ہیں، وہ میری بیٹی کو خود دیکھنے بھی آئی تھیں۔ بیٹیاں رحمت ہوتی ہیں اللہ کا فرمان بھی یہی ہے اور سچ بھی یہی ہے۔ اللہ سب کی بیٹیوں کے نصیب اچھے، سکون والے اور عزت والے بنائے۔ آمین۔

آئی ایس پی آر والی سرکاری جاب میری تیسری سرکاری جاب تھی جو مجھے ملی۔ پنجاب گورنمنٹ میں آڈیو ویژول آفیسر کی جاب سے پہلے 1986ء میں جب میں نے صرف ایف اے کر رکھا تھا، میری سلیکشن ایئر پورٹ سکیورٹی فورس میں بطور اسسٹنٹ سب انسپکٹر ہوگئی تھی لیکن میں نے جوائن نہیں کیا کہ ماسٹرز کر کے مقابلے کا امتحان دوں گا یا کسی گزٹیڈ آفیسر کی جاب کے لئے کوشش کروں گا۔ بہرحال رزق، مقام اور وقت متعین ہوتا ہے انسان نے جہاں پہنچنا ہوتا ہے وہاں پہنچتا ہے اور زندگی کا سفر جاری رہتا ہے۔ میں نے مارچ 2000ء میں بطور انفارمیشن آفیسر آئی ایس پی آر جوائن کیا اور نومبر 2012ء سے ایڈیٹر ہلال میگزین کے طور پر خدمات سرانجام دے رہا ہوں۔ اسی دوران میں نے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی۔

میں اپنے ملک میں بائی چوائس موجود ہوں، لوئر مڈل کلاس سے تعلق ہونے کے باوجود میں نے کبھی دولت کے لئے بیرونِ ملک جانے کا نہیں سوچا۔ میں نے ہمیشہ اپنے ملک میں رہ کر اپنا کردار ادا کرنے کا سوچا اور اسی مٹی سے جڑے رہتے ہوئے آگے بڑھنے کا خواہاں رہا۔ 1994ء کی بات ہے میں ایشیائی ترقیاتی بینک کے گورنمنٹ آف پنجاب کے جس پراجیکٹ میں تھا، وہاں دو آسٹریلین سپیشلسٹ بھی تھے۔ ان میں سے ایک کافی وسیع دار اور سلجھا ہوا انگریز تھا۔ اُس نے ایک مرتبہ میرے کولیگز کی موجودگی میں مجھے پوچھا کہ میری بیٹی چھٹیوں کے دوران میری فیملی کے ہمراہ پاکستان آ رہی ہے کیا آپ اُس سے شادی کرو گے؟ یہ ظاہر ہے اس نے انگریزی ہی میں پوچھا۔ ان دنوں میری صرف منگنی ہی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً کہا Thanks, I am already engaged ساتھ میں نے اُردو زبان میں دوستوں سے آہستگی سے پوچھا جو مجھے سمجھ آئی ہے آپ کو بھی وہی سمجھ میں آیا ہے؟ اس پر میرے کولیگ اور دوست طارق جاوید نے کہا ''چودھری صاحب سمجھ تے ایہو لگی اے'' بہرحال بعد میں ہمارے انگریز کولیگ کی فیملی بھی لاہور آئی ہم دیگر کولیگز نے مل کر اُنہیں ڈنر دیا اور بہت عزت دی۔ جس سے وہ لوگ بہت خوش ہوئے۔

اسی طرح 1996ء میں میرے ایک کزن اور بہنوئی شاہد کھوکھر نے میرے گھر والوں کے کہنے پر مانچسٹر سے مجھے سپانسر شپ لیٹر منگوا دیا تاکہ برٹش ایمبیسی کے ذریعے اپنا کیس پراسیس کروں لیکن میں راولپنڈی میں اپنے دوست عمر فاروق جو سعود ساحر مرحوم کے صاحبزادے ہیں، کے گھر ایک رات رہ

Scanned with CamScanner

کر واپس لاہور چلا گیا کہ برٹش ایمبیسی والے اس لیٹر کو نہیں مانتے، گویا اپنے ملک پاکستان میں رہ کر قسمت آزمانے کا فیصلہ سراسر میرا ذاتی اور ہوش و حواس میں کیا گیا فیصلہ تھا۔

کالموں کے علاوہ میں نے خاکے بھی لکھے ہیں۔ خاکے لکھنے کی طرف مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے اندر ایک فطری رجحان ہے۔ اس میں ادبی حلقوں میں اُٹھنے بیٹھنے کا عمل دخل بھی ہے۔ توفیق بٹ جو میرے کلاس فیلو تھے نے جب گورنمنٹ کالج لاہور میں تھے تو اس وقت ایک ادبی تنظیم ''ہم سخن ساتھی'' کی بنیاد رکھی تھی۔ اس تنظیم کا نام شاید بشریٰ رحمان صاحبہ نے تجویز کیا تھا۔ جب وہ 1989ء میں شعبہ صحافت میں آئے تو ڈاکٹر اجمل نیازی صاحب کی بدولت میرا ان سے ایک اچھا تعلق بن گیا۔ انہوں نے مجھے ہم سخن ساتھی کا پہلے سیکرٹری پھر نائب صدر مقرر کیا۔ ہم سخن ساتھی کے تحت بڑے بڑے ادبی فنکشنز ہوتے۔ جس میں اشفاق احمد، بانو قدسیہ، احمد ندیم قاسمی، منیر نیازی، شہزاد احمد، عطا الحق قاسمی، امجد اسلام امجد، ڈاکٹر اجمل نیازی، دلدار پرویز بھٹی، جاوید اقبال کارٹونسٹ اور بہت سے دیگر معروف ادیبوں اور شاعروں کی شرکت ہوتی۔ یوں ایک ٹیم کے طور پر ہم سخن ساتھی کے بہترین فنکشن سامنے آئے۔

ان تقریبات میں میں بھی مضامین پڑھتا، جو صاحب کتاب کی تصنیف اور شخصیت کے حوالے سے ہوتے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی شخصیات ایسی ہیں جن کے ساتھ تقریبات ہوئیں لیکن میں نے ان کے حوالے سے نہیں لکھا۔ بہت سارے خاکے میں 1997ء تک لکھ چکا تھا۔ میری خاکوں کی کتاب ''خوش باشیاں'' 2008ء میں فائن پبلی کیشنز نے شائع کی۔

کتابوں سے محبت تو بچپن میں بچوں کی کتابیں اور کہانیاں پڑھ کر پیدا ہوئی۔ پھر جب چھٹی جماعت میں والد صاحب کے ساتھ مظفر آباد آزاد کشمیر شفٹ ہوئے تو میں ان کی یونٹ میں قائم ریکریشن روم جا کر کتابوں سے استفادہ کرتا۔ چونکہ وہ آرمی یونٹ کی لائبریری تھی تو اس میں زیادہ عسکری شخصیات کی کتابیں پڑھنے کو ملتیں۔ ان میں سید ضمیر جعفری، کرنل محمد خان، صدیق سالک، مشتاق یوسفی، شفیق الرحمان کی کتب ہوتیں تو میں نے انہیں پڑھا، یوں قدرتی طور پر میرا رجحان اردو ادب میں طنز و مزاح کی جانب ہوا۔ تھوڑا سا بڑا ہوا اور اخبار پڑھنے کی طرف لگاؤ ہوا تو عطاء الحق قاسمی کے مزاحیہ کالم مجھے attract کرنے لگے۔ جب میٹرک کے بعد آرمی کے لئے اپلائی کیا تو کیپٹن (بریگیڈیئر ریٹائرڈ) صولت رضا کی کالیات اور کرنل اشفاق حسین کی جنٹلمین بسم اللہ جیسی کتابیں پڑھیں۔ کرنل اشفاق حسین جب کیپٹن تھے تو ملٹری کالج میں ہمارے انسٹرکٹر بھی تھے۔ آج بھی مجھے لگتا ہے کہ مجھے طنز و مزاح کے میدان میں زیادہ کام کرنا چاہیے

خاکے لکھنے کی طرف مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے اندر ایک فطری رجحان ہے اس میں ادبی حلقوں میں اُٹھنے بیٹھنے کا عمل دخل بھی ہے

Scanned with CamScanner

مجھے سب سے زیادہ پنجابی سے محبت ہے

پنجابی میری ماں بولی ہے، اس کے ساتھ

میری محبت ایک فطری عمل ہے

تھا۔ لیکن سرکاری مصروفیات کا تقاضا خالصتاً سنجیدہ، قومی اور بین الاقوامی موضوعات کا ہوتا ہے۔ ''ہلال'' کے اداریئے بھی قومی، ملی اور بین الاقوامی موضوعات سے متعلق ہوتے ہیں۔ سرکاری جابز میں لانگ سٹنگز کا بھی رواج ہوتا ہے تو لکھنے لکھانے کے پراجیکٹ اُس طرح سے ہو نہیں سکتے۔

جہاں تک زبان کی بات ہے تو مجھے سب سے زیادہ پنجابی سے محبت ہے۔ پنجابی میری ماں بولی ہے۔ اس کے ساتھ میری محبت ایک فطری عمل ہے۔ اس زبان میں اظہار کرنا بھی میرے لئے سب سے پسندیدہ امر ہے۔ ماں کے متعلق میرا ایک پنجابی قطعہ ہے جو مجھے بہت پسند ہے، وہ یہ ہے۔

اپنے پنڈنوں جاواں لِکن
ٹرجاواں تے آواں لِکن
ماں باجھوں ہُن کج نئیں لبھدا
کٹھیاں کراں دعاواں لِکن

پنجابی شاعری تو میں نے انٹرمیڈیٹ میں شروع کر دی تھی لیکن میری کتاب 2018ء میں قلم فاؤنڈیشن لاہور کے زیر انتظام شائع ہوئی۔ اس کا فلیپ پنجابی کے معروف ناول نگار اور شاعر زاہد حسن اور سینئر صحافی و شاعر جبار مرزا نے لکھا۔ میرا پہلا کالم 'دستک' کے عنوان سے روزنامہ جہاں نما میں 1990ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ میں نے مزاحیہ مضامین بھی لکھے ہیں اور اُن کا مجموعہ بھی تقریباً تیار ہے۔ جلد ہی منظر پر آئے گا، ان شاء اللہ۔

افسانہ میں نے کبھی نہیں لکھا۔ رجحان بھی نہیں ہے۔ طنز و مزاح کی جانب رجحان ہے۔ انشاءاللہ اس حوالے سے کچھ کام کروں گا۔ روزنامہ پاکستان لاہور کے ادبی صفحے کے ساتھ وابستہ رہا۔ اس میں لاہور کی ادبی ڈائری 'لاہور میں' کے نام سے لکھتا رہا۔ روزنامہ نوائے وقت میں 'سچی بات' کے نام سے کالم 1993ء میں لکھے۔ ان دنوں روزنامہ نوائے وقت اسلام آباد کے لئے سچی بات کے نام سے کالم لکھتا ہوں۔ جناب مجیب الرحمٰن شامی کے زیرِ ادارت شائع ہونے والے روزنامہ 'پاکستان' لاہور میں بھی میرے کچھ کالم شائع ہوئے۔ دیگر اخبارات میں بھی تحاریر شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ماہنامہ ہلال کی میگزین کی ادارت نومبر 2012ء سے کر رہا ہوں۔ کچھ ادبی مجلوں میں بھی میری تحریریں شائع ہوتی ہیں۔

افواج پاکستان کے ترجمان رسالے'' ماہنامہ ہلال'' کا میں شاید چھٹی یا ساتویں جماعت سے قاری ہوں۔ والد صاحب کی یونٹ میں یہ میگزین آتا تو میں بھی اسے دیکھتا تھا۔ پھر ملٹری کالج جہلم سرائے عالمگیر کی لائبریری میں آیا کرتا تھا، بلکہ میں نے ملٹری کالج کے لئے جو تحریری امتحان دیا تھا اس کا رزلٹ میں نے ہلال میگزین میں دیکھا تھا۔ ملٹری کالج کے بعد جب میں نے لاہور کے ایک کالج میں فرسٹ ایئر میں داخلہ لیا تو میں ہلال کا خریدار تھا۔ میرا میگزین والد صاحب کے ایڈریس پر

Scanned with CamScanner

آتا تھا۔ ابو جی ایک بریگیڈ ہیڈ کوارٹرز میں ایس ایم تھے وہاں دو میگزین آتے تھے: ایک بریگیڈ ہیڈ کوارٹرز کے نام اور دوسرا میرے نام۔ اس وقت شاید 27 یا 28 روپے سالانہ خریداری فیس تھی۔ ان دنوں ممتاز اقبال ملک جو ''ہلال'' میں آنے سے قبل لاہور سے شائع ہونے والے ہفت روزہ زندگی کے رپورٹر تھے، میں انہیں مختلف تحاریر بھیجتا رہا۔ پہلے تو وہ حیلے بہانوں سے ''ٹرخاتے'' رہے۔ میں سیکنڈ ایئر میں تھا تو میں نے ایک مضمون لکھ کر بھیجا جس کا عنوان تھا: ''فوجی تربیت کی اہمیت'' ان کا جواب آیا کہ فوجیوں کو فوجی تربیت کا بخوبی اندازہ ہے آپ اس مضمون کو کسی اور اخبار میں شائع کروائیں۔

جب میں نے مارچ 2000ء میں آئی ایس پی آر جوائن کیا تو شاید ستمبر 2000ء میں اس وقت کے ایڈیٹر میجر مستعین الرحمان (اب ریٹائر) کی پوسٹنگ آ گئی تو کرنل صولت رضا جو ان دنوں ڈپٹی ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز تھے، نے مجھے ہلال میگزین کی ادارت سونپ دی۔ میں کچھ عرصہ ہلال میں خدمات سرانجام دیتا رہا اس دوران جناب مستعین الرحمان کی پوسٹنگ رک گئی اور میں پھر سے اپنی اصل ذمہ داری پی آر سیکشن میں آ گیا۔ بہر طور جب سن 2000ء میں مجھے ایڈیٹر لگایا گیا تو اس وقت ممتاز اقبال ملک کی ذمہ داریاں ایک اور ڈائریکٹوریٹ میں تھیں۔ انہیں کسی نے بتایا کہ آئی ایس پی آر میں ایک نئے آفیسر آئے ہیں انہیں ایڈیٹر لگایا گیا ہے انہوں نے نام پوچھا تو بتایا گیا کہ یوسف عالمگیرین، تو ممتاز اقبال ملک نے فوراً کہا ''اوئے ایہہ اوہ لاہور والا منڈا اے نئیں'' (یہ وہ لاہور والا لڑکا تو نہیں)۔ میں چونکہ انہیں بہت خط لکھتا اور اپنی تحریریں بھیجتا رہتا اس لئے شاید انہیں میرا نام یاد رہ گیا۔

جہاں تک کالموں کے متعلق میرا اپنا نقطہ نظر ہے تو وہ یہ ہے کہ بعض کالم ایسے ضرور ہوتے ہیں جن کی ایک مستقل حیثیت ہوتی ہے وہ یاد رہ جاتے ہیں یا یاد رکھے جاتے ہیں لیکن بیشتر کالموں کی زندگی ایک آدھ دن سے زیادہ نہیں ہوتی۔ وہ کالم جو اپنے مواد اور ڈکشن کی بناء پر یاد رکھے جاتے ہیں ان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ صحافت اور ادب کے درمیان کی کوئی شے ہے، مکمل ادب نہیں ہے۔ ڈاکٹر اجمل نیازی کے نزدیک کالم جلدی میں لکھا گیا ادب ہے۔ ویسے ایک دور تھا جب کالم نگاروں کے نام انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ جب میں نے بھی کالم لکھنا شروع کیا اور خاص طور پر نوائے وقت لاہور میں میرے کچھ کالم شائع ہونا شروع ہوئے تو اس وقت اخبارات میں چند ایک معروف نام ہی تھے جو کالم لکھا کرتے تھے۔ میرا پہلا کالم نوائے وقت میں شائع ہوا تو انٹرنیشنل ہوٹل لاہور میں کوئی ادبی تقریب تھی وہاں عطاء الحق قاسمی صاحب بھی تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو بازو پکڑ کر اپنے ساتھ ایک طرف لے گئے اور کہا ''یار تیرا کالم پڑھیا، پڑھ کے

عطاء الحق قاسمی صاحب کہیں ملے تو کہنے لگے ''ویکھیا ای یاسر کڈے سوہنے کالم لکھ دا پیا اے!'' میں نے کہا ''سر تہاڈے تے یار دوست کالم لکھن لگ پیندے نیں، یاسر تے تہاڈا خون اے''

Scanned with CamScanner

اجمل نیازی مرحوم کی نثر میں ایک ترنم ہے، ایک نغمگی ہے، ایک آسودگی اور وارفتگی ہے، ان کے لفظ بے چین کرتے ہیں، اثر چھوڑتے ہیں

واقعی لکیا پئی کالم پڑھنے پئے آں۔ توں لکھنا نہ چھڈیں'' (یار تمہارا کالم پڑھا، پڑھ کے واقعی لگا جیسے کوئی کالم پڑھ رہے ہیں۔ تم لکھنا نہ چھوڑنا) میرے لئے وہ لمحہ یادگار لمحہ بن گیا کہ یہ بات ملک کا ایک بہت بڑا کالم نگار اور ادیب کہہ رہا تھا۔ میرے لئے یقیناً یہ ایک خوشی کا باعث تھی۔ اس سے مجھے احساس ہوا کہ کس طرح عطاء الحق قاسمی نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ پھر چند برس بعد ان کے بیٹے یاسر پیرزادہ نے بھی کالم نگاری شروع کر دی۔ مجھے عطاء الحق قاسمی صاحب کہیں ملے تو کہنے لگے ''ویکھیا ای یاسر کڈے سوہنے کالم لکھ دا پیا اے!'' (دیکھا یاسر کتنے خوبصورت کالم لکھ رہا ہے) میں نے کہا ''سر تہاڈے تے یار دوست کالم لکھن لگ پیندے نیں، یاسر تے تہاڈا خون اے'' (آپ کے تو یار دوست لکھنا شروع کر دیتے ہیں، یاسر تو آپ کا خون ہے) اس پر انہوں نے ایک بھرپور قہقہہ لگا دیا۔

مجھے شعر و شاعری سے بھی خاصی دلچسپی ہے۔ اچھا شعر چاہے کسی بھی شاعر کا ہو وہ اثر چھوڑتا ہے اور دل کو بھاتا ہے۔ کسی دور میں میں ناصر کاظمی کو کافی پڑھتا تھا۔ منیر نیازی کی شاعری بھی مختلف تھی۔ ادیبوں میں بعض بڑے اور سکہ بند نام بھی ہیں، انہیں تو ہر کوئی پڑھ ہی رہا ہوتا ہے۔ مجھے نثر میں ڈاکٹر اجمل نیازی مرحوم کی نثر بہت مختلف لگی۔ ان کی نثر میں ایک ترنم ہے، ایک نغمگی ہے، ایک آسودگی اور وارفتگی ہے۔ ان کے لفظ بے چین کرتے ہیں۔ اثر چھوڑتے ہیں۔ ان کے اسلوب اور طرز تحریر پر تحقیق کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے کہیں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ایسا ہو بھی رہا ہو۔ کالم نگاری میں عطاء الحق قاسمی کو ہمیشہ خوشدلی سے پڑھا۔ سلاست اور روانگی ان کا خاصا ہے۔ وہ لفظوں سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ بعض کالم نگاروں کے کالموں اور تحریروں سے لطیفے نکال دیں تو وہ اچھی خاصی سنجیدہ تحریر بن جاتی ہے۔ صحافت میں حمید نظامی مرحوم کی شخصیت اور کام نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا۔ انہوں نے جس انداز سے قائداعظمؒ کی رہنمائی میں ایک اردو اخبار شروع کیا اور اسے مسلمانوں کے نظریئے کا ترجمان بنایا وہ تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔

لاہور میرا سب سے پسندیدہ شہر ہے۔ اس سے بہت خوبصورت یادیں وابستہ ہیں۔ لاہور کا سینہ بہت کشادہ ہے، یہ شہر ملک بھر سے آئے ہوئے لوگوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے اور انہیں ''اون'' کر لیتا ہے۔ لاہور کی ادبی محفلیں، صحافتی یادیں، دوست اس امر کے متقاضی ہیں کہ ان پر الگ سے ایک کتاب لکھی جائے۔ یونیورسٹی کے دور میں میرا شمار بھی ورکنگ جرنلسٹس میں ہوتا تھا۔ میرے علاوہ میرے کلاس فیلوز میں تنویر شہزاد ہفت روزہ زندگی کے ساتھ وابستہ تھے۔ سجاد انور روزنامہ جنگ، ظہیر صدیقی ڈان، عرفان سہیل روزنامہ

Scanned with CamScanner

جرأت، نائلہ رضا روزنامہ مساوات کے ساتھ وابستہ تھے۔ نائلہ رضا ہماری کلاس کی واحد لڑکی تھی جو دورانِ تعلیم صحافت میں خدمات سرانجام دے رہی تھیں۔ ایم اے کرنے کے بعد تابندہ ریاض (ممتاز فلمی شاعر، صحافی ریاض الرحمٰن ساغر کی صاحبزادی) نے روزنامہ نوائے وقت جوائن کیا۔ ایم اے کرنے کے بعد تو ہماری کلاس کے بہت سے لڑکے صحافت کے شعبے میں ہیں اور سینئر حیثیت میں بہترین خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ہم نے 1992ء میں ایم اے ماس کمیونیکیشن کیا۔ اویس باجوہ، عامر خان مرحوم اور مجھے غالباً 1995ء میں خیال آیا کہ اُردو بازار سے نوٹس لے کر ایم اے اُردو کا امتحان دینا چاہئے۔ ہم تینوں دوست شام کو اویس باجوہ کے گھر جمع ہو جاتے، اویس کی امی جو تحریکِ پاکستان کی کارکن بھی رہی تھیں اور ہمیں بھی اپنے بچوں جیسا ہی سمجھتیں ہمارے لئے کھانا تیار کرتیں، ہم کھانا کھا کر سو جاتے اور صبح ناشتہ کر کے اپنے اپنے کام پر نکل جاتے۔ یوں وہ پراجیکٹ رات کے کھانے اور صبح کے ناشتے تک ہی محدود رہا۔ میں نے بہر حال 1999ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اُردو کر لیا۔ اویس باجوہ نے بھی ایم اے اُردو کی ڈگری حاصل کر لی۔ اسی طرح بیڈن روڈ لاہور پر جہاں نما اخبار کی عمارت کے بالائی حصے میں جو میرا رہائشی کمرہ تھا وہ ایک طرح سے ادبی بیٹھک بن چکی تھی۔ میرے دوست معروف شاعر ساجد گل اکثر وہاں آتے۔ محبوب الٰہی اور خالد ارشاد بھی ان دنوں ماہنامہ پلک کے ساتھ وابستہ تھے۔ لاہور کینٹ میں میرا ٹھکانہ اشتیاق احمد، جاوید سلہری اور سہیل رشید کے پاس ہوتا۔ اچھا دور تھا، اچھے لوگ تھے لائیوسٹاک ڈیپارٹمنٹ کے ایشین بینک کے پراجیکٹ میں ہم چار لوگ آڈیو ویزول آفیسر مقرر ہوئے۔ ان میں اقبال انجم، طارق جاوید، سجاد صدیقی اور راقم شامل تھے۔ بعد ازاں عبدالحمید گورایا بھی شامل ہوئے۔ کیا شاندار وقت تھا جو ہم نے گزارا!

مجھے سیاست اور سیاستدانوں سے خاص دلچسپی نہیں ہے۔ البتہ بہت سے سیاستدانوں سے صحافتی فرائض کے دوران ملاقاتیں ضرور رہیں۔ میری نظر میں سیاستدان تو بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ ہی تھے۔ اُن جیسے کھرے، حق گو، دلیر اور ثابت قدم رہنما تاریخ میں کم کم ہیں۔ اپنی منزل اور مقصد سے سچی لگن کسی نے سیکھنی ہو تو وہ قائد سے سیکھی جا سکتی ہے۔ جو وژن وہ پاکستان سے متعلق رکھتے تھے ہم اسی سے جڑے رہتے تو آج پاکستان دنیا کی جدید ترین اور خوبصورت مملکت ہوتا۔ بہت سی ادبی شخصیات سے ملاقاتیں ہوئیں انہیں قریب سے دیکھا۔ میری کتاب 'خوش باشیاں' بھی ادیبوں اور دیگر مشاہیر کے خاکوں پر مبنی ہے، میں نے جیسا ان کی شخصیات کو پایا اس کا اظہار اپنی تحریروں میں کر دیا۔ میری زندگی میں دو اہم ادبی شخصیات ایسی

بعض کالم نگاروں کے کالموں اور تحریروں سے
لطیفے نکال دیں تو وہ اچھی خاصی سنجیدہ
تحریر بن جاتی ہے

Scanned with CamScanner

لاہور کا سینہ بہت کشادہ ہے، یہ شہر ملک بھر سے آئے ہوئے لوگوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا اور اُنہیں ''اون'' کر لیتا ہے

آئیں جنہوں نے میری شخصیت پر اثر ڈالا: ایک شخصیت پروفیسر سعید راشد ہیں جو ملٹری کالج جہلم میں میرے استاد تھے۔ گفتار و کردار قائداعظم، کردار ساز اور متعدد ایسی کتب میں جنہیں پڑھ کر انسان کا کردار روشن ہوتا ہے، کے وہ مصنف تھے۔ انہوں نے جو بھی لکھا وہ مقصدیت کی بناء پر لکھا۔

مجھے ناول پڑھنے کا شوق رہا ہے۔ بانو قدسیہ کا راجہ گدھ، عبداللہ حسین کے اداس نسلیں نے متاثر کیا۔ انگریزی میں پائیلو کوہیلو کا الکیمسٹ اور ایلف شفق کا 'فارٹی رولز آف لو' منفرد اسلوب میں لکھے ہوئے ناول ہیں۔ دونوں انگریزی ناول تصوف کا رنگ لئے ہوئے ہیں۔ دیگر اصناف میں مجھے خاکے، آپ بیتی اور طنز و مزاح سے متعلق تصانیف زیادہ پسند ہیں۔ اچھی شاعری بھی ہانٹ کرتی ہے۔

مجھے کتابوں سے بے حد محبت ہے۔ کتاب بہترین دوست ہوتی ہے۔ کتاب جتنی اچھی ہو شخصیت پر اُتنا ہی خوبصورت تاثر چھوڑتی ہے اور کتابیں اگر ان شخصیات سے متعلق ہوں جن کی عمر گلستان کی آبیاری میں گزری ہو، گڈ مڈ اور بکھرے ہوئے اذہان کو بنانے اور سنوارنے میں گزری ہو، وہ جو معلم ہوں، مربی ہوں تو ایسی کتابیں یقیناً آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے ایک قیمتی اثاثہ ثابت ہوتی ہیں۔ نئی نسل کے لئے ان کتابوں کے حرف حرف میں ایسے ایسے موتی پنہاں ہوتے ہیں کہ جنہیں تلاش کرنے کی جستجو دل میں گھر کر جائے تو ذہن روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔ روشن ذہن رکھنے والے ہی خوبصورت قلب اور اوصاف کے حامل ہوا کرتے ہیں۔ کسی بھی کامیاب انسان کے بارے میں جاننا اور اسے پرکھنا ہو تو اس کا اندازہ اُن کتب سے کیا جا سکتا ہے جو اس کے زیر مطالعہ رہی ہوں۔

میں نے ذاتی طور پر راشد صاحب سے بہت Inspiration لی ہے۔ ذاتی مسائل، ان کے کام کی کوالٹی پر کبھی اثر انداز نہ ہوئے۔ ایسی خوش وضع شخصیت کہ ان کا دل بھی ان کے پیرہن کی طرح باصفا رہا۔ دنیاوی حرص و ہوس کی آلائشیں نہ کبھی ان کے مشن کے راستے میں حائل ہوئیں اور نہ ان کی انصاف پسندی کو مات دے سکیں۔ پروفیسر سعید راشد 1927ء میں بریلی میں پیدا ہوئے، علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی 1950ء میں ملٹری کالج میں درس و تدریس کا آغاز کیا ساری عمر یہیں گزار دی۔ بیسیوں کتابیں لکھیں۔ اُن کا اسلوب منفرد انداز کا حامل تھا۔ 1999ء میں دارِفانی سے کوچ کر گئے لیکن وہ آج بھی اپنے شاگردوں کے دلوں میں شمع کی مانند زندہ و تابندہ ہیں۔ شمع سے شمع یوں ہی جلا کرتی ہے۔

دوسری شخصیت ڈاکٹر اجمل نیازی ہیں، جن سے 1983ء میں اسلامیہ کالج کینٹ میں شاگردی کا تعلق قائم ہوا اور ان کی وفات تک قائم رہا۔ بعد میں شاگردی کا یہ تعلق دوستی میں تبدیل ہو چکا تھا۔ پہلی مرتبہ 1985ء میں وہ ہمیں ریڈیو پاکستان

لاہور لے کر گئے۔ میں نے وہاں ایک غزل پڑھی۔ اسلام شاہ مرحوم اس پروگرام کے پروڈیوسر تھے اور اجمل نیازی میزبان تھے، مجھے اس کے چالیس روپے ملے جو میرے لئے بہت بڑے اعزاز کی بات تھی۔ مجھے کالج میگزین 'سرچشمہ' کا سٹوڈنٹ مدیر بھی ڈاکٹر اجمل نیازی ہی نے بنایا۔ اسلامیہ کالج کینٹ سے وہ گورنمنٹ کالج لاہور چلے گئے میں اُنہیں وہاں بھی ملنے جایا کرتا۔ وحدت کالونی لاہور میں اُن کے گھر کا میں ریگولر وزیٹر تھا۔ اُن کے حوالے سے بہت سی یادیں ہیں۔ ڈاکٹر اجمل نیازی کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا تھا جو شعر وادب کی دُنیا میں اپنا لوہا منوا چکے تھے۔ اجمل نیازی میانوالی سے لاہور پڑھنے آئے اور پھر یہیں کے ہو کے رہ گئے۔ ان کے والد تھانیدار تھے اس کے باوجود شریف آدمی اس لئے تھے کہ انہوں نے تھانیداری سے استعفا دے دیا تھا۔ اجمل نیازی خوبصورت آدمی تھے اور خوبصورتیاں پسند کرتے تھے۔ بعض خوبصورتیاں لفظوں کی صورت میں ان کے اندر سے پھوٹتی رہتی ہیں۔ عورت کے بارے میں ان کے ریمارکس بھی اپنی جگہ خوب ہیں۔ ایک دن کہہ رہے تھے ''اچھی بھلی عورت جب بیوی بنتی ہے تو وہ بلا بن جاتی ہے۔'' گویا عورت بُری نہیں اگر بیوی نہ ہو تو............! اجمل نیازی سے کسی نے پوچھا، ان دنوں کیا سرگرمیاں ہیں؟ کہنے لگے: سر کا تو پتہ نہیں بس گرمیاں ہی گرمیاں ہیں۔ ان کی بے نیازیاں بعض اوقات لوگوں کو تڑپا کے رکھ دیتی تھیں۔ اجمل نیازی خواب وخیال کی دُنیا میں مگن ایک شخصیت کا نام تھا۔ ان کا خیال تھا کہ لتا منگیشکر ضرور جنت میں جائے گی کیونکہ اس نے اپنی گلوکاری کے ذریعے بہت سے لوگوں کا دل خوش کیا ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ اگر لتا جنت میں نہ جا سکی تو میں خود اُس کو جنت میں لے کر جاؤں گا۔ میں نے کسی دوسرے کے لئے جنت کی اتنی شدید خواہش کرتے ہوئے اُن کے علاوہ کسی اور کو نہیں دیکھا۔ اجمل نیازی کے والد چونکہ پولیس آفیسر تھے لہٰذا مختلف لوگوں سے ان کا پالا پڑتا تھا۔ ایک مرتبہ نواب زادہ نصر اللہ خان ان کے والد سے ملنے گئے تو اجمل نیازی اور ان کے دیگر بہن بھائیوں نے نوابزادہ کی رُومی ٹوپی چارپائی کی اَدوائن سے باندھ دی۔ نواب زادہ صاحب نے جاتے ہوئے ٹوپی اٹھانا چاہی تو ناکامی کا سامنا ہوا۔ اس واقعہ کے بعد نوابزادہ صاحب نے اپنے پاس ہمیشہ دو ٹوپیاں رکھنا شروع کر دیں، ایک سر کے لئے دوسری حُقے کے لئے۔ اجمل نیازی انوکھے آدمی تھے۔ کسی کی عزت کرتے تھے تو اس کی غیر موجودگی میں بھی کرتے۔ بے عزتی پر آمادہ ہوتے تو سامنے بٹھا کر ایسی خبر لیتے کہ جن کی بے عزتی نہ ہو رہی ہو، وہ بھی محتاط ہو جاتے تھے۔

اجمل نیازی ادبی جنگل کے شیر تھے، وہ چاہتے تو کسی بات پر خوش ہو جاتے اور چاہتے تو ناراض ہو جاتے۔ ایک مرتبہ ان کی کسی ادیب سے ہلکی پھلکی

اپنی منزل اور مقصد سے سچی لگن کسی نے سیکھنی ہو تو وہ قائدؒ سے سیکھی جا سکتی ہے، جو وژن وہ پاکستان سے متعلق رکھتے تھے ہم اسی سے جڑے رہتے تو آج پاکستان دنیا کی جدید ترین اور خوبصورت مملکت ہوتا

Scanned with CamScanner

اجمل نیازی خوبصورت آدمی تھے اور خوبصورتیاں
پسند کرتے تھے، بعض خوبصورتیاں لفظوں کی
صورت میں ان کے اندر سے پھوٹتی رہتی ہیں

ناراضی چل رہی تھی۔ مجھے وہ ادیب کہیں ملا تو میں نے اُسے کہا: اجمل صاحب آپ کا بڑی محبت سے ذکر رہے تھے۔ اجمل نیازی کو میرے اس جملے کا پتہ چلا تو بڑے سیخ پا ہوئے کہ مجھے کیا ضرورت ہے میں ایسے بندوں کا محبت سے ذکر کرتا پھروں۔ اجمل نیازی کار چلا رہے ہوتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے ایف سولہ جہاز اڑا رہے ہوں۔ ایک مرتبہ اُن کی گاڑی کہیں لگ گئی تو میں نے پوچھا: ''سر! گاڑی کہیں ماری ہے؟'' تو کہنے لگے ''کیوں اسیں نئیں مار سکدے'' (کیوں ہم گاڑی نہیں مار سکتے)۔ گویا ہر وہ کام جو دوسرے لوگ کرتے ہیں اجمل نیازی اُسے کرنا اپنا استحقاق سمجھتے تھے۔ وہ دلیر آدمی تھے لہٰذا اپنے حصے کی محبتیں تو درکنار نفرتیں بھی چھین لیتے۔ نیازی صاحب کو شعر اور نثر دونوں پر ملکہ حاصل تھا۔ اُن کا سفرنامہ بھارت ''مندر میں محراب'' تو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: ''کوئی ہندو اپنی بیٹی کا جہاں بھی رشتہ طے کرتا وہ انکار کر دیتی۔ آخر اس نے تنگ آ کر اپنی بیٹی سے پوچھا: تو ہی بتا تجھے کیسا شوہر چاہئے؟۔ بیٹی نے اپنے لئے موزوں پتی (شوہر) کی جب ڈیڑھ دو سو صفات گنوائیں تو بوڑھا ہندو تنگ آ کر بولا: بیٹی تجھے پتی چاہے یا راشٹر پتی۔''

لاہور مجھے کئی نسبتوں سے عزیز ہے۔ 1983ء سے لے کر 2000ء تک تعلیم اور ملازمت کے کئی ماہ و سال وہاں گزارے۔ یوں لاہور روح میں رچ بس گیا۔ لاہور کے ساتھ محبتوں کے کئی پہلو ہیں۔ ایک مستند پہلو ڈاکٹر اجمل نیازی تھے جو نہ صرف فرسٹ ایئر میں میرے اُستاذِ گرامی تھے بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ ایک مربی، ایک رہنما اور ایک دوست کے طور پر سامنے آئے۔ میں گزشتہ بیس برس سے اب راولپنڈی میں ہوں تو کسی نہ کسی طور ان کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے اور اُن سے رابطہ بھی رہتا۔ وہ ان دنوں علیل تھے۔ ڈاکٹر صاحب کئی حوالوں سے جلالی آدمی تھے۔ اپنے غصے اور خوشی دونوں نہیں چھپا سکتے تھے۔ ان کا برملا اظہار کرنے سے کبھی نہ چوکتے۔ جو دل میں آیا کہہ دیا۔ گویا وہ کبھی لگی لپٹی رکھنے والے شخص نہیں رہے۔ اسی لئے اُن کا شمار ایسے لوگوں میں رہا جو دوسروں سے ذاتی فائدے نہیں اٹھاتے بلکہ ذاتی منفعت کا حصول شاید ان کے لئے کبھی ترجیح ہی نہیں رہا۔ میں کالج کے زمانے میں ان کے پاس وحدت کالونی لاہور کے جس گھر میں جاتا تھا وہ وفات تک وہیں پر رہائش پذیر رہے۔ اب ان کا یہ گھر اُن کے بیٹے احسن نیازی کے نام ہے جو پنجاب گورنمنٹ میں آفیسر ہے۔ یہ وہی گھر ہے جس کی بیل دینے پر اکثر ڈاکٹر صاحب خود ہی دروازے کی چٹخنی کھولنے کے لئے سامنے موجود ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کی مغفرت فرمائیں۔ آمین ثم آمین۔

بہت سی سیاسی، عسکری اور ادبی شخصیات ہیں جن کے ساتھ میری یادیں وابستہ ہیں۔ دلدار پرویز

Scanned with CamScanner

بھٹی صاحب سے بھی کئی ملاقاتیں رہیں۔ دلدار پرویز بھٹی 30 اکتوبر 1994ء کو اس وقت خالق حقیقی سے جا ملے جب وہ شوکت میموریل ہسپتال کی تعمیر کے سلسلے میں چندہ جمع کرنے امریکہ گئے ہوئے تھے۔ وہ ممتاز کمپیئر، ماہر تعلیم، کالم نگار اور فنکار ہی نہیں عظیم المرتبت انسان بھی تھے جو دوسروں کو تکلیف میں مبتلا دیکھتے تو تڑپ اٹھتے اور ان کی ہر ممکن مدد کرتے۔ مجھے ان کو انتہائی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ کئی بیواؤں کے گھروں کے چولہے ان کی دی ہوئی امداد سے جلتے تھے۔ وہ نادار لوگوں کی مدد کرنے اور یتیم بچیوں کی شادی کروانے میں ہمیشہ معاونت کرتے رہے اور اپنی امارت کا یہ عالم تھا کہ رحلت کے وقت ان کے بینک اکاؤنٹ میں صرف دس ہزار روپے تھے۔

لاہور میں ایک شاعر کی بیٹی کی شادی کے موقع پر مختلف شاعر اور ادیب حضرات مدعو تھے۔ کسی ادیب نے دلدار بھٹی کی عدم موجودگی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ دلدار کو آج تو آنا چاہیے تھا، اس پر لڑکی کا باپ چپ نہ رہ سکا اس نے کہا: ''دلدار خود تو نہیں آیا لیکن میں نے آپ لوگوں کی آؤ بھگت کے لئے گوشت کی جو دیگیں پکوا رکھی ہیں، وہ دلدار کے پیسوں سے تیار ہوئی ہیں''۔ دلدار بھٹی جو بظاہر انتہائی تیز طرار دکھائی دیتے تھے، اندر سے اتنے ہی سادہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دلدار کا ایک دوست ان کا پلاٹ بیچ کر تقریباً دو لاکھ روپے ہضم کر گیا۔ دراصل وہ خود اتنے صاف آدمی تھے کہ انہیں کبھی دوسروں پر شک ہوتا ہی نہیں تھا۔

میں اور برادرم توفیق بٹ (معروف کالم نگار) اکثر چھٹی والے دن دلدار بھٹی کے ہاں چلے جایا کرتے۔ ایک دفعہ گئے تو انہوں نے مختلف چیزیں میز پر سجانا شروع کر دیں۔ جب سب چیزیں رکھ چکے تو کہنے لگے آؤ بھئی ناشتہ کر لیں۔ ہم نے کہا ''جی ہم تو ناشتہ کر کے آئے ہیں'' تو کہنے لگے ''میں گھنٹے دا قوالی کرن، ڈیاں سالی، تسیں اس ویلے کیوں نئیں بولے''۔ (میں گھنٹے سے جو آپ کے لئے میز پر کھانے سجا رہا ہوں تو کیوں نہیں بتایا۔ کیا میں ''قوالی'' کر رہا تھا؟)۔ ان کی باتیں ایسی ہی مزے دار ہوتی تھیں۔ دلدار کے چاہنے والے انہیں کبھی نہ بھلا پائیں گے۔ میں نے عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد، ڈاکٹر اجمل نیازی، عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی، شوکت علی، طارق فاروق، حسین شاد اور دیگر احباب کو دلدار کے لئے دھاڑیں مار کر روتے ہوئے دیکھا۔ صاحب کتاب شاعر جناب انجم یوسفی مرحوم نے روتے ہوئے کہا کہ مجھے لگتا ہے میں نے یہ شعر دلدار کے غم میں لکھا۔

کرچی کرچی ہو گیا انجم اب کیا ہونا باقی ہے
آنکھیں مجھ سے پوچھ رہی ہیں کتنا رونا باقی ہے

دلدار بھٹی کی بذلہ سنجی سے بھلا کون واقف نہیں۔ ایک مرتبہ ان کے ٹی وی پروگرام ''پنجند'' میں کسی آدمی نے سوال کا جواب دے کر گھی کا ڈبہ

ایک مرتبہ نواب زادہ نصر اللہ خان اجمل نیازی کے والد سے ملنے گئے تو اجمل اور ان کے دیگر بہن بھائیوں نے نوابزادہ کی رُومی ٹوپی چارپائی کی اَدوائن سے باندھ دی، نوابزادہ نے اٹھانا چاہی تو ناکامی کا سامنا ہوا

Scanned with CamScanner

ایک مرتبہ اجمل نیازی کی گاڑی کہیں لگ گئی تو میں نے پوچھا: ''سر! گاڑی کہیں ماری ہے؟'' تو کہنے لگے ''کیوں اسیں نئیں مار سکدے؟''

جیت لیا۔ اتفاق سے اس آدمی کے سر پر بال بالکل نہیں تھے' دلدار نے اسے دیکھتے ہی کہا'' ایہہ لوگھیودا ڈبہ کڈاو ڈاچیر کڈ کے آئے او تسیں'' (یہ لیس گھی کا ڈبہ آپ کتنی بڑی مانگ نکال کر آئے ہوئے ہیں)۔ دلدار اپنے دوستوں کا ادب کی حد تک احترام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ہم لوگ جناب عطاء الحق قاسمی کے گھر بیٹھے ہوئے تھے۔ عطاء الحق قاسمی نے دلدار بھٹی کے کسی کالم کی تعریف کی تو دلدار نے اٹھ کر ان کے گھٹنوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا کہ آپ میرے کالم کی تعریف کر رہے ہیں تو وہ واقعتاً اچھا ہوگا۔

دلدار پرویز بھٹی کی تمام عمر لوگوں کی خدمت کرتے گزر گئی۔ انہوں نے ایک مرتبہ خود بتایا کہ'' مجھے جو پیسے آتے ہیں' میں نے جمع کرنے شروع کر دیئے تاکہ کوئی مکان وغیرہ خریدا جا سکے لیکن کچھ عرصے بعد مجھے پیسے آنے ہی بند ہو گئے۔ تب مجھ پر عیاں ہوا کہ اللہ مجھے نہیں بلکہ میرے ذریعے لوگوں کو دیتا ہے۔ لہٰذا میرا ان پیسوں پر کوئی حق نہیں۔ میں نے دوبارہ اسی طرح دوسروں کی مالی مدد شروع کر دی اور مجھے بھی پہلے کی طرح فنکشن ملنے لگے''۔ دلدار بھٹی کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ انہوں نے اپنی مرحومہ بہن کی بیٹی اور بیٹے کو اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ بھانجی کی شادی انہوں نے اپنی زندگی ہی میں کر دی تھی۔ دلدار بھٹی کی زندگی محبتوں اور قربانیوں کا مرقع تھی۔ ان کی یاد آج بھی دلوں میں خوشبو کی مانند بکھرتی اور نکھرتی محسوس ہوتی ہے۔ ڈاکٹر فقیر محمد فقیر (پنجابی زبان کے ممتاز شاعر اور اداکار سہیل احمد (عزیزی) کے نانا) نے شاید دلدار جیسے لوگوں ہی کے لئے کہا تھا:

لوکاں دے نال رکھ فقیرا ایسا بھین کھلون
کول ہوویں تے ہسن سارے نہ ہوویں تے رون

معاشرے میں بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جو اپنے حصے کا کام اس لگن اور دیانت سے انجام دیتی ہیں کہ وہ معاشرے میں باعثِ فخر بن جاتی ہیں۔ ڈاکٹر امجد ثاقب بھی ان شخصیات میں سے ایک ہیں۔ صوبہ پنجاب کے شہر کمالیہ میں پیدا ہونے والے امجد ثاقب نے ایم بی بی ایس کیا لیکن ڈاکٹری کے جھنجھٹ میں پھنسے رہنے کی بجائے سول سروسز جوائن کر لی۔ چند سالوں بعد ڈاکٹر امجد ثاقب کو سول سروسز بھی جھنجھٹ محسوس ہونے لگا تو انہوں نے اپنے لئے ایک ایسے سفر کا چناؤ کر لیا جس کے خدوخال ابھی واضح نہیں تھے، نہ اس کی منزل کا اس طرح سے تعین تھا۔ جس طرح ڈی ایم جی گروپ کو بطورِ اسسٹنٹ کمشنر جوائن کرنے والے کے سامنے ایک ''منزل'' ہوتی ہے کہ وہ کبھی وفاقی سیکرٹری کے طور پر ریٹائر ہوگا۔ ڈاکٹر امجد ثاقب نے افسری اور شاہانہ ٹھاٹ بھاٹ چھوڑ کر ''اخوت'' کی بنیاد ڈال دی اور اپنے ملک کے غریبوں اور بے کسوں کو کسبِ حلال پر اس طرح لگانے کا تہیہ کر لیا کہ جس سے ان کے وقار پر بھی کوئی آنچ نہ آئے اور ان کا گھر بھی چلتا رہے کہ انہیں دو وقت کی روٹی کے لئے دوسروں کی

Scanned with CamScanner

جانب نہ دیکھنا پڑے۔ ڈاکٹر امجد ثاقب نے اخوت کے پلیٹ فارم سے ضرورت مند شہریوں کو چھوٹے چھوٹے کاروبار کے لئے چند چند ہزار روپے کے قرضے دے کر انہیں نہ صرف اپنے پاؤں پر کھڑا کیا۔ بلکہ انہیں اس قابل بنایا کہ وہ ملکی و قومی ترقی میں اپنا کوئی کردار ادا کر سکیں لوگوں نے اخوت سے حاصل کردہ قرضوں سے منیاری کے سامان، فروٹ اور سبزی کی ریڑھی کریانہ سامان سمیت سینکڑوں ایسے کاروبار کئے جن سے ان کا گھر کا خرچہ نکلنا شروع ہوا۔ قابلِ قدر امر یہ ہے کہ شہریوں نے نہ صرف اپنے گھر کے لئے منافع کمایا بلکہ اس رقم سے اخوت سے حاصل کردہ قرضہ کی رقم بھی واپس کی۔ اس طرح سے ان کی دلوں میں یہ احساس بھی اجاگر ہوا کہ وہ اپنی محنت اور جدوجہد کے بل بوتے پر اس مقام پر فائز ہوئے کہ ان کے گھر والوں کو عزت کی روٹی نصیب ہوئی ہے۔

ڈاکٹر امجد ثاقب کی کتاب اخوت کا سفر اس کا بخوبی احاطہ کرتی ہے کہ کس طرح انہوں نے اخوت کا سفر شروع کیا اور لمحہ لمحہ یہاں تک پہنچے اور وہ کون کون لوگ اور ادارے تھے جو ان کے ساتھ کھڑے ہو گئے اور آج اخوت ملک کا ایک مستند اور معتبر ادارہ ہے۔ اس سے قبل صرف بنگلہ دیش کے محمد یونس کے گرامین بینک کی مثال دی جایا کرتی تھی لیکن اب اخوت کا حلقہ اثر اور خدمات کا دائرہ گرامین بینک سے چنداں کم نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اخوت کے مقاصد اور کاوشوں کو نہ صرف ملک میں بلکہ عرب امارات اور امریکہ سمیت دنیا بھر کے مما لک میں سراہا گیا ہے۔ حال ہی میں انہیں ''ستارہ امتیاز'' ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ خدا کرے ڈاکٹر امجد ثاقب کی اخوت کا سفر یوں ہی رواں دواں رہے۔ کہ ڈاکٹر امجد ثاقب کا سفر ''سروری دین ماخدمت گری است'' سے عبارت ہے۔

کسی دور میں لاہور کا ادبی منظر نامہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن لاہوری کے تذکرے کے بغیر نامکمل محسوس ہوتا تھا۔ ان کے ساتھ بھی میری خوب ملاقاتیں رہیں۔ لوگ انہیں ''مجاہدِ اردو'' ڈاکٹر فضل الرحمٰن لاہوری کے نام سے جانتے تھے۔ مجاہد اردو کا خطاب انہیں ڈاکٹر سید عبداللہ نے مال روڈ پر انگریزی کے سائن بورڈ توڑنے پر دیا تھا۔ اردو کو قومی زبان کا درجہ نہ دینے کی پاداش میں انہوں نے لاہور ایئرپورٹ پر اس وقت کے وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی سٹاف کار کے بونٹ پر ایک مکا بھی رسید کیا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے بطورِ صدر پنجاب یونیورسٹی میں اپنا پہلا خطاب کیا تو ''مجاہدِ اردو'' اٹھ کھڑے ہوئے اور بھٹو سے کہا آپ صدرِ پاکستان ہیں لہٰذا قومی زبان اردو میں خطاب کریں۔ اس پر بھٹو نے کہا جناب یہاں فارن میڈیا کے لوگ آئے ہوئے ہیں ان کی سہولت کے لئے انگریزی میں تقریر کر رہا ہوں۔ اس پر مجاہد اردو نے انہیں بخوشی اجازت دے دی۔ لیکن تقریب ختم ہونے کے بعد انہیں خفیہ

بیٹی نے اپنے لئے موزوں پتی (شوہر) کی

جب ڈیڑھ دو سو صفات گنوائیں تو بوڑھا ہندو تنگ

آ کر بولا: ''بیٹی تجھے پتی چاہیئے یا راشٹر پتی؟''

Scanned with CamScanner

دلدار بھٹی جو بظاہر انتہائی تیز طرار دکھائی دیتے تھے اندر سے اتنے ہی سادہ تھے، یہی وجہ ہے کہ دلدار کا ایک دوست ان کا پلاٹ بیچ کر تقریباً دو لاکھ روپے ہضم کر گیا

پولیس نے سائیڈ پر لے جا کر اپنے طریقے سے سمجھایا۔ مجاہد اردو کے ساتھ اس طرح کا سلوک لاہور ایئرپورٹ پر ذوالفقار علی بھٹو کی گاڑی کو مکا مارنے پر بھی ہو چکا تھا لیکن جیسے ہی خفیہ پولیس کو ان کی نیک نیتی کا معلوم ہوتا انہیں چھوڑ دیا جاتا۔

ان کے بہت سے واقعات مجھے یاد ہیں۔ ایک مرتبہ مجاہد اردو جب حج کرنے گئے تو وہاں انہوں نے صرف ایک ہی دعا مانگی کہ رب تعالیٰ مجھے پاکستان کا صدر بنا دے۔ کاش! انہیں معلوم ہوتا کہ صدر بننے کے لئے دعا کافی نہیں ہوتی۔ بہرکیف مجاہد اردو کے اندر کی یہ لگن تھی اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا تھا، جب رفیق تارڑ صدر منتخب ہو گئے تو ان کے خلاف یا برخلاف ایک امیدوار ڈاکٹر فضل الرحمٰن لاہوری بھی تھے۔ لیکن عدالت نے یہ کہہ کر کہ ''آپ جیسے لوگ عدالت کا وقت ضائع کرتے ہیں ان کے کاغذات مسترد کر دیئے''۔ بقول مجاہد اردو اللہ تعالیٰ بڑا کارساز ہے۔ وہ جیسے ہی عدالت سے باہر نکلے تو آگے ''بی بی سی'' والے کھڑے تھے انہوں نے مجاہد اردو کی بیسیوں کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے خبریں چلائیں کہ اتنی کتابیں لکھنے کے بعد بھی کوئی صدارتی امیدوار نہیں ہو سکتا تو ایسا پاکستان ہی میں ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے بی بی سی والوں نے مجاہد اردو کی کوئی بھی کتاب نہ پڑھی اور نہ ہی دیکھی تھی پھر بھی انہیں اچھا نہیں لگا کہ کوئی صاحبِ کتاب اس حق سے محروم کیوں رہے۔

صدر رفیق تارڑ کے مقابل الیکشن لڑتے ہوئے تو وہ اس حد تک پر یقین تھے کہ انہوں نے اپنی کابینہ بھی اناؤنس کر رکھی تھی۔ ان کی کابینہ میں عطاالحق قاسمی، امجد اسلام امجد اور طارق فاروق مرحوم وفاقی وزرا ہوتے۔ جبکہ انہوں نے مجھے ''پریس سیکرٹری ٹو پریذیڈنٹ'' لگانا تھا۔ یہ تو عرفان صدیقی صاحب کے نصیب تھے کہ رفیق تارڑ صدر بن گئے وگرنہ ان کی بجائے میں خود (یوسف عالمگیرین) ایوانِ صدر میں موجود ہوتا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ انہوں نے جو کابینہ اناؤنس کی اور جو پورٹ فولیوز دیئے ان میں ایک ''وزارتِ تعلیم برائے طلبہ'' بھی تھی۔ طالبات افیئرز کا چارج جناب مجاہد اردو نے اپنے پاس رکھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ صدر چونکہ ''فادر آف دی نیشن'' ہوتا ہے لہٰذا وہ یہ فرائض بہتر طور پر سرانجام دے سکتے ہیں۔ مجاہد اردو تو حج کے موقع پر دعا مانگنے کے بعد صدارتی انتخابات میں کامیابی کے حوالے سے اس حد تک پرعزم تھے کہ وہ دوسری شادی کسی انتہائی پڑھی لکھی خاتون سے کر کے انہیں خاتونِ اول کا درجہ دینا چاہتے تھے لیکن شاید ان کی پہلی بیوی کو اس کی خبر ہو گئی ہو اور اس نے صدارتی انتخابات سے قبل ہی گھر میں مصلیٰ بچھا کر اپنا گھر اجڑنے سے بچانے کی دعائیں شروع کر دیں، یوں مجاہد اُردو بُری طرح ناکام ہو گئے۔

مجاہد اُردو جس سے زیادہ خوش ہوتے اس کو شاد باغ کی ایک مخصوص دکان سے جلیبیاں بھی

Scanned with CamScanner

ضرور پیش کرتے۔ ان کے بقول عطاالحق قاسمی اور منو بھائی کے بعد راقم تیسرا خوش قسمت تھا جس کو جلیبیاں تحفے میں ملیں۔ شاید انہی جلیبیوں کی تاثیر ہے کہ میں کئی برس قبل لاہور سے راولپنڈی آ گیا لیکن آج بھی قیادت کے فقدان کے معاملے پر میری نگاہ انتخاب 22 کروڑ عوام میں سے مجاہد اردو ہی پر پڑتی ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت محترمی عطاالحق قاسمی اور منو بھائی مرحوم کی بھی رہی ہوگی۔ مجاہد اردو کے ''ویل وشرز'' تو بہت رہے ہیں لیکن جب مقدر ساتھ نہ دے تو جلیبیاں بھی رنگ نہیں لاتیں۔

اسی طرح ڈاکٹر صفدر محمود جن کا کچھ عرصہ قبل انتقال ہوا بھی ایک ایسی شخصیت تھے جو ہمیشہ وطن سے جڑے رہے۔ ڈاکٹر صاحب تحریک پاکستان، قیام پاکستان اور پھر پاکستان کی تکمیل کے جاری مراحل کے چشم دید گواہ تھے۔ پاکستان افیئرز کے حوالے سے ان کی کتب ایک مستند حوالے کے طور پر یاد رکھی جائیں گی۔ ڈنگہ تحصیل کھاریاں میں پیدا ہونے والے ڈاکٹر صفدر محمود کا یوں تو ضلع گجرات سے تعلق بنتا تھا لیکن ان کے مقصدِ حیات اور پاکستانی امور سے ان کے عشق نے انہیں پاکستان کے ہر گھر کا فرد بنا دیا تھا۔ وہ لوگوں کے دلوں میں زندہ تھے۔ نظریہ پاکستان اور پاکستان کے حوالے سے جب جب بعض لوگوں کی طرف سے شوشے چھوڑے گئے، وہ میدان میں کود پڑتے۔ وہ پاکستان پر حملے کو اپنی ذات پر حملہ قرار دیتے ہوئے حقائق کی بنیاد پر ایک ایک نکتے کا جواب دیتے اور لوگوں کے اذہان میں جو ابہام پیدا کئے جاتے وہ انہیں ختم کرنے میں کردار ادا کرتے رہے۔ تاریخ اور علوم پاکستان کے طالب علم ان کی تحریروں سے رہنمائی حاصل کرتے۔ ان سے ملنا ہمیشہ علم وشعور کے حصول کا ذریعہ بنتا۔ وہ تعلقات میں جتنے وضع دار تھے اتنے ہی تحریر اور گفتگو میں بھی تھے۔ برادرم توفیق بٹ نے نوے کی دہائی میں جب ادبی تنظیم ''ہم سخن ساتھی'' بنائی تو ڈاکٹر صفدر محمود بہت باقاعدگی سے اس میں تشریف لاتے۔ جن دنوں وہ ایڈمنسٹریٹو سٹاف کالج لاہور کے ڈائریکٹر تھے، توفیق بٹ اور میں ان کے آفس بھی جاتے رہے۔ وہ ہمیشہ انہماک سے کام کر رہے ہوتے۔ ان کا یہ رویہ زندگی کے باقی معاملات میں بھی رہا اور وہ آخر دم تک قائداعظم کے قول کام، کام اور کام کی عملی تصویر بنے دکھائی دیئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی یہی رویہ جاری رکھا۔ وہ لاہور کی ایک معروف یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ ملک کے ایک معروف اخبار میں کالم بھی لکھتے رہے۔ قومی اور بین الاقوامی ایشوز سے متعلق ان کی کتب بھی تواتر سے شائع ہوتی رہیں۔ کرنٹ افیئرز کا ڈائجسٹ بھی ان کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ اس ڈائجسٹ کا مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے والوں کو شدت سے انتظار رہتا۔

میں بطور ایڈیٹر ماہنامہ ہلال میگزین ڈاکٹر صفدر محمود سے ہلال کے لئے مضامین بھی لکھواتا رہا۔ ان

دلدار بھٹی نے کہا، میں نے پیسے جمع کرنے شروع کر دیئے تاکہ کوئی مکان خریدا جا سکے لیکن کچھ عرصے بعد مجھے پیسے آنے ہی بند ہو گئے، تب مجھ پر عیاں ہوا کہ اللہ مجھے نہیں بلکہ میرے ذریعے لوگوں کو دیتا ہے

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر امجد ثاقب نے افسری چھوڑ کر ''اخوت'' کی بنیاد ڈال دی اور غریبوں اور بے کسوں کو کسبِ حلال پر اس طرح لگانے کا تہیہ کرلیا کہ جس سے ان کے وقار پر بھی کوئی آنچ نہ آئے اور ان کا گھر بھی چلتا رہے

سے اس بابت طویل گفتگو بھی ہوتی۔ دفتری اوقات میں جب انہوں نے کبھی کال کرنی ہوتی تو پہلے وٹس ایپ پر کال کا وقت طے کرتے پھر ٹھیک اس وقت پر ان کی کال آتی اور کہتے میں نے آپ سے تین باتیں کرنی ہیں: پہلی یہ، دوسری یہ اور تیسری یہ۔ گویا وہ فون پر فضول اور لمبی گفتگو سے پرہیز کرتے اور بات شروع کرنے سے قبل یہ طے کرتے کہ کن امور پر بات کرنی ہے تاکہ کال وصول کرنے والا بھی اِدھر اُدھر کی باتوں میں الجھنے کی بجائے جو ضروری بات ہے اسی پر توجہ مرکوز رکھے۔ بلاشبہ ڈاکٹر صفدر محمود جیسی شخصیات جہاں علم و شعور بکھیرتی ہیں وہ آئندہ نسلوں کے لئے تربیت کا باعث بھی بنتی ہیں کہ معاملات زندگی کو کس طرح سے چلایا جائے۔ ان کی درجنوں تصانیف ایسی ہیں جنہیں ملکی اور بین الاقوامی سطح پر سراہا گیا ان کی کتابوں کے تراجم ازبک، چینی، جرمن، بنگالی اور سندھی زبانوں میں کئے گئے۔ یوں وہ پڑھے جانے والے اور سراہے جانے والے مصنفین کے طور پر زندہ رہے۔

ڈاکٹر صفدر محمود راوین تھے اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں راویز کو پڑھاتے بھی رہے۔ جن دنوں وہ وہاں لیکچرار تھے سابق وزیراعظم نواز شریف بھی ان کے سٹوڈنٹ رہے۔ ڈاکٹر صفدر محمود بعدازاں مقابلے کا امتحان پاس کر کے سول سروسز میں چلے گئے اور جب نواز شریف وزیراعلیٰ پنجاب بنے تو ڈاکٹر صفدر محمود سیکرٹری ٹو چیف منسٹر تھے۔ وہ سول سروسز میں دیانت، میرٹ اور صاف گوئی کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔ ان کا یہی وصف ان کی تحریروں میں بھی دکھائی دیا۔ بہرکیف سول سروسز میں بھی ان کی ایک منفرد شناخت رہی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ میرٹ پر معاملات چلانے پر زور دیا۔ پھر بھی کسی کا کوئی جائز کام ہوتا تو وہ ضرور مدد کرتے۔

روزنامہ جہاں نما لاہور کے چیف ایڈیٹر جناب طارق فاروق مرحوم اس واقعہ کے راوی ہیں کہ جب ڈاکٹر صفدر محمود سیکرٹری ٹو چیف منسٹر تھے وہ اُنہیں کسی کام کے سلسلے میں ملے اور بتایا کہ وہ گورنمنٹ کالج میں ان کے سٹوڈنٹ بھی رہ چکے ہیں۔ اتفاق سے طارق فاروق مرحوم بھی گورنمنٹ کالج لاہور میں اس وقت کے وزیراعلیٰ نواز شریف کے کلاس فیلو تھے۔ طارق فاروق مرحوم نے کسی کام کے سلسلے میں وزیراعلیٰ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو ڈاکٹر صفدر نے انہیں فوری وزیراعلیٰ سے ملوا دیا اور بتایا کہ طارق فاروق بھی گورنمنٹ کالج میں آپ ہی کی کلاس میں تھے۔ اس پر نواز شریف بہت خوش ہوئے اور طارق فاروق مرحوم کا جو جائز کام تھا وہ بھی کروا دیا۔ بلکہ جب طارق فاروق وزیراعلیٰ کے آفس سے باہر نکل رہے تھے وزیراعلیٰ نواز شریف نے ڈاکٹر صفدر محمود صاحب سے کہا'' صفدر صاحب ایناں دا کم ہتھ کروا وی دینا'' (ان کا کام اب کروا بھی دیجئے گا)۔ گویا ڈاکٹر صفدر کی شخصیت لوگوں کے لئے ایک خیر کثیر کا باعث بھی رہی۔ انہوں نے تمام عمر شعور کی روشنی

Scanned with CamScanner

بانٹی۔ظاہر ہے جس کے پاس جو ہوتا ہے وہ وہی تقسیم کرتا ہے۔جس کے پاس خیر ہوتی ہے وہ خیر ہی تقسیم کرے گا۔محبتیں تقسیم کرے گا۔

سابق وزیرِ اعظم جناب معراج خالد مرحوم کو بھی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔بہت سادہ طبیعت اور صاف گو شخصیت کے مالک تھے۔ان میں تصنع اور خود نمائی بالکل نہیں تھی۔ایک دفعہ ہم سخن ساتھی کی کوئی تقریب ''شیزان ہوٹل'' مال روڈ تھی تو مجھے اُنہیں لکشمی مینشن سے اُن کے گھر سے لے کر آنا تھا۔میں مقررہ وقت پر پہنچ گیا، وہ تیار ہو رہے تھے۔میں تھوڑی دیر ان کے ڈرائینگ روم میں بیٹھا وہ آ گئے اور کہا چلئے فیر؟ میں نے کہا جی بالکل! ڈرائنگ روم سے باہر نکلے تو میں نے دیکھا کہ ان کے پاس گاڑی نہیں تھی۔میں نے پوچھا، سر! گاڑی کہاں کھڑی ہے؟ کہنے لگے ''چھڈو پراں کیہ کرنا اے گڈی نوں'' آؤ دونویں جنے ٹردے جانے آں اسیں بس ریگل چوک ای تے کراس کرنا اے''۔ (چھوڑو گاڑی کو کیا کرنا ہے۔بس ہم دونوں پیدل چلتے ہیں، بس ریگل چوک ہی تو ہمیں کراس کرنا ہے)۔یوں میں اور مہمان خصوصی سابق وزیرِ اعظم معراج خالد پیدل چلتے ہوئے شیزان ہوٹل پہنچے۔سب ان کا انتظار کر رہے تھے۔ان کے ہوٹل پہنچتے ہی تقریب شروع ہوگئی۔

جہاں تک عسکری شخصیات کا تعلق ہے تو بہت سی عسکری شخصیات کو نہایت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔زندگی رہی تو ان شخصیات پر تفصیل کے ساتھ اپنی یادداشتیں بیان کروں گا لیکن ایک عسکری شخصیت ایسی ضرور ہے جس نے میری ذات پر بہت گہرے نقوش چھوڑے۔وہ تھے سابق کور کمانڈر لاہور لیفٹیننٹ جنرل (ر) محمد اسلم شاہ مرحوم۔میں نے 31 مارچ 1985ء کو کور ہیڈ کوارٹرز میں ان سے این سی سی کے بہترین کیڈٹ کی شیلڈ وصول کی تھی۔یہ وہ دور تھا جب عید کے مواقع پر صرف ایک میسج یا وٹس اپ کر کے لوگ بری الذمہ نہیں ہو جاتے تھے بلکہ عید کارڈ خریدے جاتے یا پرنٹ کروائے جاتے اور بڑے وقار کے ساتھ بھجوائے جاتے۔میں بھی دوستوں اور اساتذہ کرام کو عید کارڈز بھیجا کرتا تھا۔میں نے ایک عید کارڈ کور کمانڈر کو بھی بھجوا دیا اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ان کا مجھے نہ صرف جوابی عید کارڈ آیا بلکہ اس میں عید کارڈ کے لئے باقاعدہ شکریہ بھی ادا کیا گیا۔پھر کیا تھا ایک سیکنڈ ایئر کے بچے کے لئے ایسا اور کیا موقع ہو سکتا تھا۔اس کے بعد اُن کے ساتھ باقاعدہ خط کتابت شروع ہوگئی۔ان کے کچھ خطوط شاید آج بھی میرے پاس محفوظ ہوں۔اس میں اہم بات یہ ہے کہ جس کور کے وہ کور کمانڈر تھے اُسی کور کے انڈر کمانڈ ایک آرٹلری بریگیڈ ہیڈ کوارٹرز میں میرے والد گرامی صوبیدار میجر تھے۔میرا اپنا ایڈریس تو تھا کوئی نہیں اور میری تمام ڈاک میرے والد صاحب کی معرفت آیا کرتی۔اور وہ شاید اپنے ہاتھ سے خط کا جواب لکھتے اور اس پر

ذوالفقار علی بھٹو نے بطورِ صدر پنجاب یونیورسٹی میں اپنا پہلا خطاب کیا تو ''مجاہدِ اردو'' اٹھ کھڑے ہوئے اور بھٹو سے کہا آپ صدرِ پاکستان ہیں لہٰذا قومی زبان اردو میں خطاب کریں

Scanned with CamScanner

صدر رفیق تارڑ کے مقابل الیکشن لڑتے ہوئے مجاہد اردو پر یقین تھے، اپنی کابینہ بھی اناؤنس کر رکھی تھی، جس میں عطاالحق قاسمی، امجد اور طارق فاروق وفاقی وزرا ہوتے، مجھے انہوں نے ''پریس سیکرٹری ٹو پریذیڈنٹ'' لگانا تھا

ایڈریس لکھ کر اُسے پوسٹ کرواتے۔ میں نے اخبار میں پڑھا کہ اُن کی پوسٹنگ منگلا کے کور کمانڈر کے طور پر ہوگئی ہے تو میں نے اُنہیں خط لکھا کہ میں 'کال آن' کرنا چاہتا ہوں۔ خط ملتے ہی کور کمانڈر سٹاف نے برگیڈ ہیڈ کوارٹرز میں رابطہ کیا کہ ایس ایم محمود عالم صاحب کے بیٹے کو فلاں دِن اتنے بجے بھجوا دیں، کور کمانڈر سے ملاقات ہے۔ ہو سکتا ہے افسران کا بھی ''تراہ'' نکلا ہو کہ یہ کیا کہانی ہے۔ ایک کالج سٹوڈنٹ کور کمانڈر سے مل کر کیا کرے گا۔ میں مقررہ وقت پر پہنچ گیا۔ اُن کے اے ڈی سی کیپٹن منشا نے مجھے چائے پلائی اور مجھے کور کمانڈر کے آفس میں بھجوا دیا گیا۔ وہ مجھے مل کر خوش ہوئے، میرے والد صاحب کا حال چال پوچھا اور کہا کہ آپ پی ایم اے کے لئے اپلائی کر رہے ہیں؟ تو میں نے اثبات میں جواب دیا، انہوں نے اس پر خوشی کا اظہار کیا۔ میں اُن کے لئے ایک یادگاری شیلڈ بنوا کر لے گیا تھا جو ایکس کمانڈر این سی سی کی جانب سے تھی۔ میرے لئے وہ ایک بھرپور ملاقات تھی، اتنے بڑے آفیسر کے ساتھ اُس کے آفس میں ملاقات وہ بھی انتہائی خوشگوار ماحول میں۔ اس کے بعد بھی میں اُن سے رابطے میں رہا۔ میں 1989ء میں ایک دفعہ راولپنڈی کسی انٹرویو کے سلسلے میں آیا تو اُن کو کال کی۔ انہوں نے کہا انٹرویو کے بعد ریس کورس روڈ پر میرا گھر ہے آپ وہاں تھوڑی دیر کے لئے آئیں۔ میں حسبِ وعدہ اُن کے گھر پہنچا تو انہوں نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ وہاں کچھ اور بھی سینئر افسران بیٹھے ہوئے تھے لیکن انہوں نے مہمان نوازی کے تقاضوں کے مطابق جس طرح ایک مہمان سے بات کرنا ہوتی ہے میری جانب رُخ کر کے مجھ سے باتیں کرتے رہے اور پوچھا کیا کر رہے ہیں؟ میں نے بتایا پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے جرنلزم کر رہا ہوں اور ساتھ بتایا کہ ایک اخبار میں پارٹ ٹائم جاب بھی کر رہا ہوں۔ اُنہوں نے اس بات کو appreciate کیا۔ کہنے لگے میں بھی ان دنوں کبھی کبھار ایک انگریزی اخبار میں آرٹیکل لکھتا ہوں۔ آپ بھی لکھتے رہیں۔ محنت کرتے رہیں۔ پھر جب 2000ء میں میں آئی ایس پی آر کے لئے سلیکٹ ہو کر آیا تو اُنہیں بتایا کہ میں راولپنڈی شفٹ ہو گیا ہوں، اُن سے وقت لے کر ملنے گیا تو انہوں نے پوچھا کس پوسٹ پر سلیکٹ ہو کر آئے ہیں؟ میں نے بتایا کہ ایف پی ایس سی کے ذریعے گریڈ ستر ہ میں بطورِ انفارمیشن آفیسر جوائن کیا ہے تو کہنے لگے:

"I am happy to listen about your grade but don't stay in ISPR. Keep doing the Journalism may be at some stage you become an editor of The News or some other good newspaper"

Scanned with CamScanner

(مجھے آپ کے گریڈ کے بارے میں سُن کر خوشی ہوئی ہے لیکن آپ مستقل طور پر آئی ایس پی آر میں نہ رہیے گا۔ جرنلزم کرتے رہیں شاید کسی وقت آپ دی نیوز یا کسی اور اچھے اخبار کے ایڈیٹر بن جائیں)۔

میں سمجھتا ہوں کہ ایسی ایڈوائس صرف ایسی شخصیت دے سکتی ہے جو آپ کو کسی شعبے میں بہت آگے بڑھتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہو۔ اُن کا مشورہ ایک صاحبِ بصیرت اور دردِ دل رکھنے والے انسان کا مشورہ تھا۔ میں راولپنڈی ہی میں رہا، ایک آدھ مرتبہ آفس کے نمبر پر اُن کی کال بھی آئی۔ درمیان میں کچھ وقفہ آیا کہ میں بھی بچوں کی پڑھائی اور غمِ روزگار میں لگ گیا۔ میں نے شاید 2014ء میں اُنہیں ہلال میگزین بھجوائے کہ وہ دیکھیں ہلال اب کس قدر بدل گیا ہے۔ اگر وہ چاہیں تو کسی وقت اس کے لئے لکھیں بھی۔ دو روز بعد ان کے بیٹے جمال شاہ صاحب کی کال آئی کہ یوسف بھائی، ابو (جنرل اسلم شاہ) کی گزشتہ برس رحلت ہوگئی میں خبر سُن کر گم سُم ہوگیا کہ مجھے راولپنڈی میں رہتے ہوئے اُن کی رحلت کی خبر نہ ہوئی۔ وہ ریس کورس قبرستان میں دفن ہیں، کبھی کسی جنازے پر جاؤں یا کسی قبر پر حاضری دینا ہو تو میں جنرل صاحب کی قبر پر کھڑے ہو کر اُن کی مغفرت کی دعا ضرور کرتا ہوں۔ اللہ کریم اُن کے درجات بلند فرمائے۔ بلاشبہ وہ اللہ کے خاص بندے ہوتے ہیں جو لوگوں کے ساتھ تعلق جوڑتے ہیں۔

شاید وہ دور بڑے لوگوں کا دور تھا۔ اپنے عہدوں کی رعونت اور تمکنت کی بنا پر لوگوں کو 'بلاک' کرنے والے لوگ ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔

فروری 2016ء میں ہم سب کے خیر خواہ اور دوست ڈاکٹر احسن اختر ناز نے بھی رختِ سفر باندھ لیا۔ جب ناز صاحب فوت ہوئے تو ڈاکٹر ثاقب ریاض کا تین حرفی میسج آیا ''ناز صاحب ڈائیڈ''، مجھے یوں لگا جیسے زمین ہل گئی ہو۔ جیسے اللہ کی دی ہوئی کوئی نعمت تھی جو ہاتھ سے پھسل کر نیچے گر گئی اور کرچی کرچی ہوگئی۔ لوگ نہیں رہتے بس یادیں رہ جاتی ہیں۔ لوگ جب زندہ ہوتے ہیں تو ہم اُن سے کم ملتے ہیں لیکن جب چلے جاتے ہیں تو آنسو بہاتے ہیں۔ معروف ادیب احسن اختر ناز جتنے ہنس مکھ، جملہ باز اور دوست نواز تھے، آخری وقت اتنا ہی پریشانی میں گزرا کہ شوگر کے مرض میں مبتلا رہے۔ رحلت سے کچھ عرصہ قبل ان کی ایک ٹانگ بھی کاٹ دی گئی لیکن بیماری پورے جسم میں سرایت کر چکی تھی۔ لاہور کے شیخ زید ہسپتال میں تھے جب ان کی ٹانگ کاٹی گئی، مجھے لاہور سے کسی دوست کا میسج آیا میں نے ڈاکٹر ناز کے فون پر کال کی، نمبر اٹینڈ نہ ہوا تو میں نے ایک ایس ایم ایس کر دیا اور اُن کی خیریت دریافت کی۔ ایس ایم ایس کا بھی فوری جواب نہ آیا لیکن اُس سے اگلے روز دوپہر کے وقت ڈاکٹر ناز کا محبت بھرا جواب آیا جس میں خیریت دریافت کرنے پر شکریہ ادا کیا گیا۔ ناز صاحب سراپا

جناب فاروق لغاری مرحوم نے کہا جن سیاستدانوں نے کرپشن کی ہے انہیں سمندر میں پھینک دینا چاہئے۔ اس پر سامان غنی جوان دنوں نوائے وقت سے منسلک تھے نے فوراً کہا پھر تو سارے سیاستدانوں کو سمندر میں پھینکنا پڑے گا

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر احسن اختر ناز کی رحلت کی خبر لوگوں پر بجلی بن کر گری، اُن کے سیکڑوں دوست اور شاگرد غمزدہ تھے

محبت تھے، سب کے ناز اٹھانے والے تھے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر ناز ڈاکٹر مسکین حجازی کی لڑی کے چند آخری موتیوں میں سے ایک تھے۔ ڈاکٹر مسکین حجازی سے بہت سے لوگوں نے بہت کام لئے۔ کچھ چاپلوسی بھی کرتے رہے، کچھ خوشامد، لیکن ڈاکٹر مسکین حجازی کا کمال تھا کہ وہ ہر کسی کے لئے خیرِ کثیر تھے انہیں جن کے بارے میں یہ بھی معلوم ہوتا کہ یہ صرف کام نکلوانے کے لئے دائیں بائیں پھر رہے ہیں وہ اُن کے کام بھی فراخدلی سے کر دیتے۔ ڈاکٹر احسن اختر ناز بھی ہر کسی کے لئے موجود ہوتے۔ یوں لگتا وہ سب ہی کے دوست تھے۔

جب ہم پنجاب یونیورسٹی میں ماسٹرز کر رہے تھے تو ناز صاحب یونیورسٹی کے پبلک ریلیشنز آفیسر تھے اور ایک آدھ مرتبہ ڈاکٹر شفیق جالندھری نے انہیں ہماری کلاس کو 'تعلقاتِ عامہ' پر لیکچر دینے کے لئے بھی مدعو کیا۔ اُن کا سٹائل ایسا تھا کہ پیریڈ کا وقت 'ہنسی خوشی' گزر جاتا۔ پھر جب وہ پی ایچ ڈی کر رہے تھے تو گوجرانوالہ کے کسی صاحب کے کتب خانے تک انہیں Access درکار تھی۔ جو صرف اُس وقت کے ڈی جی لائبریریز عبدالجبار شاکر کے ذریعے ممکن تھی۔ کالم نگار توفیق بٹ اُن دنوں چودھری اقبال جو وزیرِ تعلیم تھے کے سٹاف آفیسر تھے، اس نے چودھری صاحب سے کہہ کر میری ڈیوٹی بھی چودھری صاحب کے ساتھ لگوا رکھی تھی کیونکہ مجھے سی ایس ایس کے پیپرز دینے تھے اور لاہور میں رہنا تھا۔ ہم لوگ چونکہ چلڈرن کمپلیکس میں قائم دفتر میں بیٹھتے تھے تو شاکر صاحب سے اکثر وہاں ملاقات ہوتی۔ میں نے شاکر صاحب سے سفارشی چٹ حاصل کر کے ڈاکٹر احسن اختر ناز کے حوالے کی۔ اب عبدالجبار شاکر بھی اس دنیا میں نہیں ہیں اور ڈاکٹر احسن اختر ناز بھی نہیں رہے۔

دلدار بھٹی فوت ہوئے تو الحمراء ہال میں 'ہم سخن ساتھی' نے اُن کی یاد میں تقریب منعقد کی سب نے انہیں یاد کیا' لیکن حنیف رامے مرحوم نے بڑی خوبصورت باتیں کیں اور کہا ''اج دلدار نوں روندے او، اونہوں کنا کوں جا کے مل دے سو'' ان کا مطلب تھا کہ جو آج آپ کے پیارے ہیں انہیں جا کر ملیں' اُن سے رابطے میں رہیں کل خدانخواستہ وہ نہیں رہیں گے تو اُن کے لئے رونے کا کیا فائدہ؟ دلدار بھٹی تو سب کا دلدار تھا۔ انہیں لوگ آج بھی یاد کرتے ہیں۔ ڈاکٹر احسن اختر ناز کی رحلت کی خبر لوگوں پر بجلی بن کر گری۔ اُنکے سیکڑوں دوست اور شاگرد غمزدہ تھے۔ احسن اختر ناز ایک ادبی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ اُن کے والدِ گرامی جناب مجذوب چشتی مرحوم بہت زبردست شاعر تھے۔ اُن کی مزاحیہ شاعری اور منفرد انداز میں اُسے پیش کرنے کا ہنر انہی کا خاصا تھا۔ وہ پنجاب یونیورسٹی کی رہائشی کالونی میں اپنے پی آر او بیٹے کے ساتھ رہتے تھے۔ توفیق بٹ اور میں انہیں کسی تقریب کا دعوت نامہ دینے جاتے تو وہ بغیر چائے پیئے نہ آنے

Scanned with CamScanner

دیتے۔ اُس وقت چائے کا مزہ اور بھی دوبالا ہو جاتا جب پنجاب یونیورسٹی کے پی آر او احسن اختر ناز ہاتھ میں چائے بسکٹ کی ٹرے اٹھائے ہوئے اپنے والد کے دوستوں کو چائے پیش کرتے۔ وہ اپنے والد سے بہت محبت کرتے تھے۔ اُس کا صلہ اُنہیں یوں ملا کہ آج اُن کے سیکڑوں سٹوڈنٹس اُنہیں یاد کر کے اُن کی مغفرت کے لئے دعا کرتے ہیں۔ یہی صدقہ جاریہ ہے جو اس دنیا سے جانے کے بعد اُن کے کام آئے گا۔

یوسف عالمگیرین کا بچپن (1973ء)

میرا 2013ء میں اوپن یونیورسٹی میں ایم فل ماس کمیونیکیشن کے لئے Viva تھا۔ میں جب کمیٹی کے سامنے پیش ہوا تو احسن اختر ناز (جو کسی اور سٹوڈنٹ کے Viva کے لئے آئے ہوئے تھے لیکن وہ بھی اندر ہی تھے) کو بھی کمیٹی ممبر کے طور پر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر فوراً سیٹ سے اٹھے اور بغلگیر ہوئے اور اندر بیٹھے ہوئے کمیٹی ممبران سے کہا، آپ نے اتنے سینئر رائیٹر، کالم نگار، شاعر اور صحافی کو ابھی تک ایم فل کی ڈگری نہیں دی ہوئی اور ساتھ ہی مخصوص سٹائل میں ایک دو جملے بھی پھینکے جس سے ماحول خوشگوار ہو گیا۔ موقع چاہے کوئی بھی ہو وہ کبھی کسرِ نفسی سے کام نہ لیتے۔ جو کہنا چاہتے برملا کہہ دیتے۔ ایسے لوگ یقیناً معاشرے میں خال خال تھے جو ایک ایک کر کے اٹھتے جا رہے ہیں۔ کسی نے اُن کی رحلت کی خبر پر کمنٹ کیا تھا کہ یہ ایک جنریشن کے جانے کا ٹائم ہے اور لوگ ایک ایک کر کے جا رہے ہیں۔ احسن اختر ناز کا شمار شاید ابھی جنریشن کے اُس گروپ میں نہیں ہوتا تھا کہ جن کو جانا ہے لیکن بیماری اور موت کب کسی کو پوچھ کر آتے ہیں جب یہ آتے ہیں اور آ کر چلے جاتے ہیں تو پیچھے رہ جانے والوں کو صدمے سے نڈھال کر دیتے ہیں اور عمر بھر کی تشنگی دے جاتے ہیں۔

بس باتیں چھڑتی ہیں تو ذہن میں کیا کیا یادیں تازہ ہوتی چلی جاتی ہیں۔ صحافت اور سیاست کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ان میں دوستیاں بھی رہتی ہیں اور دشمنیاں بھی۔ صحافیوں اور سیاست دانوں میں تند و تیز جملوں کے تبادلے ہوتے ہیں تو کبھی کبھار شدید الزامات کی بوچھاڑ بھی ہو جاتی ہے۔ شاید 1999ء کی بات ہے، آواری ہوٹل میں ملت پارٹی کے سربراہ سابق صدر فاروق لغاری کی پریس کانفرنس تھی راقم اُردو نیوز کے لاہور میں رپورٹر کی حیثیت سے کانفرنس کور کرنے کے لئے موجود تھا کہ جناب فاروق لغاری مرحوم نے کہا جن سیاستدانوں نے کرپشن کی ہے انہیں سمندر میں پھینک دینا چاہئے۔ اس پر سینئر صحافی برادرم سلمان غنی جوان دنوں شاید نوائے وقت سے منسلک تھے نے فوراً کہا پھر تو سارے سیاستدانوں کو سمندر میں پھینکنا پڑے گا۔ یہ جملہ جناب لغاری کے

Scanned with CamScanner

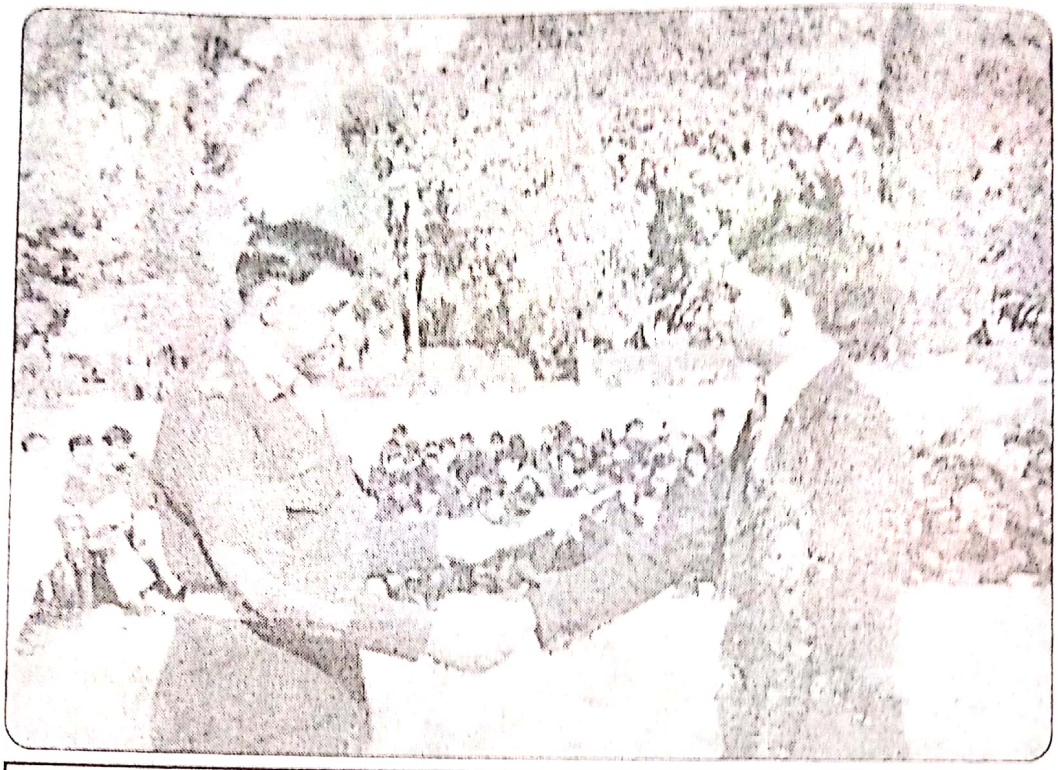

بریگیڈیئر عبدالستار (کمانڈنٹ ملٹری کالج جہلم) کیڈٹ محمد یوسف کو باسکٹ بال کے بہترین کھلاڑی کا سرٹیفکیٹ دے رہے ہیں (1982ء)

محمد اصغر، عابد قریشی، بشریٰ رحمٰن، دِیا انجم عارف، بلقیس ریاض اور عابد قریشی کے ساتھ (1993ء)

Scanned with CamScanner

لئے بہت اچانک اور اچنبھا تھا۔ انہوں نے ذرا سا توقف کرتے ہوئے کہا، ہاں پھر تو بہت سے صحافیوں کو بھی اس پاداش میں سمندر میں پھینکنا پڑے گا۔ اس پر پریس کانفرنس میں موجود صحافی حضرات نے بھی ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

نصر اللہ غلزئی بھی یاد آرہے ہیں۔ انہوں نے 15 مارچ 2009ء کو اس جہان فانی سے کوچ کیا۔ وہ مرنجاں مرنج طبیعت کے حامل، کھل کر قہقہہ لگانے والے اور بروقت جملہ کسنے والی ایک ایسی شخصیت تھے جو جلد ہی لوگوں کے دلوں میں گھر کر جاتے ہیں۔ وہ اخبار، ریڈیو، ٹی وی سمیت ہر میڈیم کا گہرا

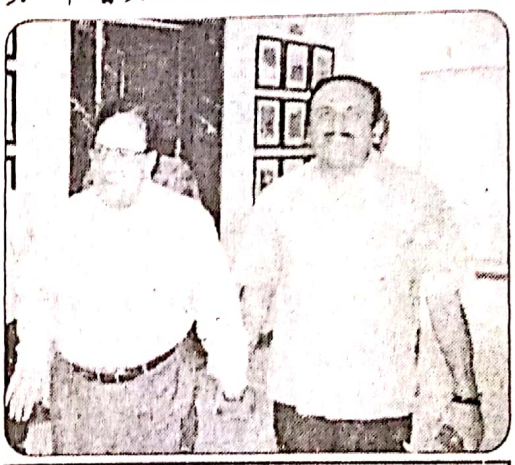

عطاء الحق قاسمی کے ساتھ خوشگوار موڈ میں

تجربہ رکھتے تھے۔ ہفت روزہ زندگی اور ہفت روزہ تکبیر کے ساتھ رہے۔ پھر ثروت جمال اصمعی نے جب تکبیر گروپ سے الگ ہو کر کراچی سے ایک میگزین جاری کیا تو آپ اس کے لیے بھی لکھتے رہے۔ اس سے قبل ایک عرصہ تک وہ نوائے وقت میں لکھتے رہے۔ پنجاب یونیورسٹی شعبہ صحافت میں ہمارا سیشن 91-1989ء تھا۔ تو انہوں نے کچھ عرصہ ہمیں بطور وزیٹنگ پروفیسر پڑھایا تھا، یوں زمانہ طالب علمی ہی سے ان کے ساتھ ہمارا احترام کا تعلق پیدا ہو گیا جس میں مزید گہرائی تب پیدا ہوئی جب دسمبر 97ء میں پنجاب حکومت کی جانب سے ایشیائی ترقیاتی بینک کے ایک پراجیکٹ کو بند کئے جانے پر سینکڑوں لوگ بے روزگار ہو گئے تو ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ میں وہاں آڈیو یژول آفیسر تھا۔ انہی دنوں میرے ایک کلاس فیلو اور دوست ریاض الحق نے بتایا کہ لاہور میں ''اردو نیوز'' جدہ کے رپورٹر کی اسامی خالد منہاس کے جدہ جانے سے خالی ہوئی ہے۔ میں نے رؤف طاہر (مرحوم) جو خود بھی اردو نیوز کے آفس کے لیے سلیکٹ ہو چکے ہیں سے بات کر لی ہے اور نصر اللہ غلزئی صاحب جو بیورو چیف ہیں کہہ رہے ہیں کہ جلدی سے سی وی دے دیں تاکہ وہ اسے جدہ نیوز کے پاکستان بیورو چیف مقصود یوسفی کے ذریعے جدہ بھجوا سکیں۔ معروف اینکر جنید سلیم بھی ان دنوں اردو نیوز جدہ کے سعودی عرب آفس کے ساتھ منسلک تھے جبکہ اسلام آباد میں سعود ساحر بیورو چیف اور خالد عظیم رپورٹر تھے۔ بہرکیف نصر اللہ غلزئی صاحب کو مزنگ میں واقع اردو نیوز جدہ کے بیورو آفس میں سی وی دینے گیا تو انہوں نے مجھے فوراً پہچان لیا اور بہت خوش ہوئے۔ غلزئی صاحب نے کہا کہ یہ اپرووال آتی رہے گی، آپ کل سے دفتر آنا شروع کر دیں۔ یوں میں اردو نیوز جدہ کے ساتھ منسلک ہو گیا۔

اردو نیوز جدہ میں میری تنخواہ چھ ہزار روپے تھی جبکہ میں اس وقت ایک مقامی اخبار میں پانچ ہزار روپے لے رہا تھا۔ یوں پورے ایک ہزار روپے کا فرق تھا جو ظاہر ہے میرے لیے بہت اچھا تھا۔ خیر میں نے اردو نیوز جدہ میں کام کرنا شروع کر دیا لیکن میرے ذہن میں جو ایک ''بیورو چیف'' اور ''باس''

Scanned with CamScanner

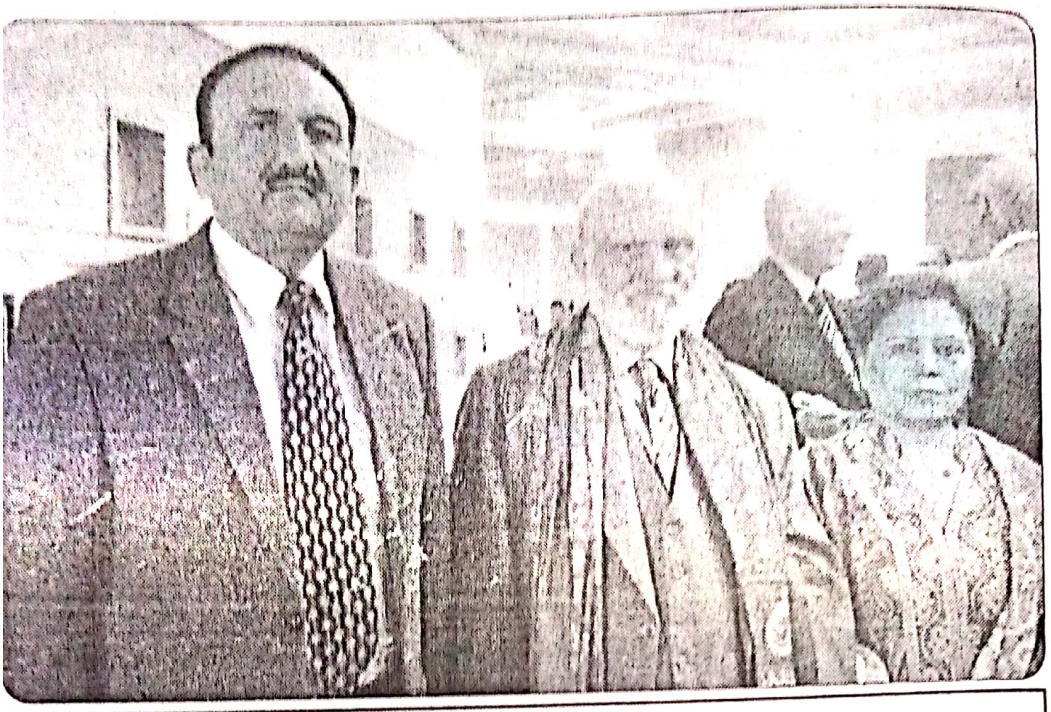

محمود شام اور مسز محمود شام کے ہمراہ

میاں محمد اظہر، اجمل نیازی اور یوسف عالمگیرین (1997ء)

Scanned with CamScanner

کا تصور تھا نصر اللہ غلزئی اس سے قطعی مختلف نکلے۔ ان کا کام کرنے کا انداز یقیناً میرے لیے رہنمائی کا باعث تھا۔ وہ کبھی میری لکھی ہوئی خبر کی تصحیح نہ کرتے اور کہتے ''آپ لگن سے کام کرتے ہیں، آپ خبریں کراچی آفس بھجوا دیا کریں''۔ میرے پاس چونکہ موٹر سائیکل نہیں تھی تو میں اکثر ان کی موٹر سائیکل پر ان کے ساتھ کسی پریس کانفرنس یا تقریب میں جاتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک فائیو سٹار ہوٹل کے باہر وہ موٹر سائیکل سٹینڈ پر کھڑی کر رہے تھے تو سٹینڈ والا لڑکا بھاگتا ہوا آیا کہ سر جی ٹوکن لے لیں۔ میں نے اسے انتہائی شائستگی سے بتایا کہ ہم صحافی ہیں اور آپ کے

سعود ساحر مرحوم کے ساتھ

ہوٹل نے صحافیوں کے لیے الگ پارکنگ بنائی ہوئی ہے، لہٰذا ٹوکن کس بات کا؟ اس پر نصر اللہ غلزئی صاحب فوراً بولے ''نہیں یار، میں موٹر سائیکل صحافیوں والے حصے میں کھڑی نہیں کرتا، ادھر یعنی نارمل پارکنگ ہی میں کھڑی کروں گا اور ساتھ ہی انہوں نے پانچ روپے کا نوٹ لڑکے کو تھما دیا۔ پھر مجھے کہنے لگے: ''یوسف صاحب، اگر ہم صحافت میں اتنے سال گزارنے کے بعد بھی پانچ روپے نہیں خرچ کر سکتے تو پھر کیا فائدہ؟۔ اس سے مجھے احساس ہوا کہ کسی طرح وہ خواہ مخواہ کے ''صحافتی فوائد'' سے گریز کرتے۔ ان کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کی ضروریات کا بھی خیال رکھتے۔ ایک دن مجھے کہنے لگے کہ اردو میگزین کے لیے آپ ادبی شخصیات کے انٹرویوز کر کے بھجوایا کریں۔ یوں میں نے ان کے حکم پر سب سے پہلے امجد اسلام امجد جو اس وقت ''اردو سائنس بورڈ'' کے چیئرمین تھے کا انٹرویو کیا۔ جب یہ انٹرویو جدہ بھجوانے لگا تو کہنے لگے کہ اگر آپ اپنے نام سے بھجوائیں گے تو وہ آپ کو اس کا معاوضہ نہیں دیں گے کہ یہ انٹرویو ہمارا اپنا رپورٹر کر رہا ہے تو اضافی معاوضہ کس بابت کا؟ جبکہ میں جانتا ہوں کہ اس میں آپ کی ''ایکسٹرا ایفرٹ'' بھی صرف ہوئی ہے تو آپ کو کچھ مالی فائدہ تو ہونا چاہیے لہٰذا آپ ان انٹرویوز کو کسی قلمی نام سے بھجوا دیا کریں تاکہ چیک اس کے نام سے آیا کرے۔ میں نے کہا: ''قلمی نام کا بینک اکاؤنٹ کیسے کھلواؤں''؟ اس پر وہ ہنستے ہوئے کہنے لگے کہ یار کسی دوست کے نام سے بھجوا دیا کریں۔ یوں میں نے امجد اسلام امجد، بشریٰ رحمن، اصغر ندیم سید اور مزاح نگار یونس بٹ کے انٹرویوز اپنے ایک دیرینہ دوست ناصر محمود کے نام سے بھجوائے جو شائع ہوئے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جدہ میں بیٹھی ہوئی ٹیم نے امجد اسلام امجد کے انٹرویو کی تعریف کی اور اس کا معاوضہ ایک ہزار روپے بھجوا دیا۔ اب ہوا یہ کہ نصر اللہ غلزئی صاحب نے جدہ والی ٹیم میں سے کسی دوست کو رازدارانہ انداز میں کہہ دیا کہ یار یہ انٹرویو نگار ہے تو اپنا یوسف عالمگیرین ہی، یہ ویسے کسی دوست کے نام پر انٹرویوز بھجوا رہا ہے۔ یوں جب اگلی بار انٹرویو کے لیے چیک آیا تو وہ پانچ سو روپے کا تھا جو یقیناً میرے لیے اچنبھے کی بات تھی۔ یوں میں نے چند انٹرویوز کرنے پر ہی اکتفا کیا۔ اس پر وہ اکثر مسکراتے اور کہتے کہ

Scanned with CamScanner

توفیق بٹ، عجب گل اور البیلا کے ساتھ

آصف بھلی اور رؤف طاہر مرحوم کے ساتھ

Scanned with CamScanner

بار غلطی ہوگئی، مجھے اس دوست کو نہیں بتانا چاہیے تھا۔

میں 2000ء میں انٹر سروسز پبلک ریلیشنز (تعلقات عامہ پاک فوج) گیا تو یہاں لاہور سے جو شخص سب سے پہلے مجھے ملنے کے لیے آیا وہ یہ نصر اللہ غلزئی صاحب تھے۔ وہ جب بھی پنڈی آتے تو مجھ سے ضرور ملتے۔ بعد میں وہ پاکستان ریلویز ہیڈ کوارٹرز لاہور میں ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز ہو گئے۔ نصر اللہ غلزئی مرحوم ایک عظیم انسان تھے۔ ہمیشہ اپنے ملک اور نظریے کے ساتھ جڑے رہے۔ 1999ء میں جب بھارتی وزیر اعظم واجپائی لاہور

فوک گلوکار شوکت علی کے ہمراہ

آئے اور گورنر ہاؤس میں تقریب تھی تو بھارتی قومی ترانے پر جب سب لوگ کھڑے ہو گئے تو نصر اللہ غلزئی اپنے ایک دوسرے ساتھی صحافی سمیت بیٹھے رہے۔ جیسے ہی ترانہ ختم ہوا تو امریکہ سے آئی ہوئی ایک بھارتی خاتون صحافی بھاگتی ہوئی غلزئی صاحب کے پاس پہنچی اور کہنے لگی کہ آپ ترانے پر کیوں کھڑے نہ ہوئے؟ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ میں بھارت کی انسانیت سوز اور پاکستان مخالف پالیسیوں کی وجہ سے اس کی بالکل عزت نہیں کرتا۔ صحافی نے پوچھا کیا آپ 47ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے؟ وہ بولے کہ ہاں میں اپنے خاندان کے متعدد افراد کے خون کی قربانی دے کر یہاں پہنچا تھا۔ اس کے بعد اس امریکی صحافی نے ایک امریکی اخبار میں غلزئی صاحب کا نام لکھ کر یہ رپورٹ شائع کی تو احساس تفاخر کے ساتھ غلزئی صاحب مجھے وہ رپورٹ دکھاتے ہوئے بہت خوش ہو رہے تھے۔

صحافت میں بہت سے لوگوں سے کچھ نہ کچھ سیکھا ہے۔ کئی لوگوں کے ساتھ باقاعدہ کام نہیں کیا لیکن اُن کے تجربات اور رویوں سے آگاہی حاصل کی۔ لاہور کے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں ایک تقریب میں جرنلزم ڈیپارٹمنٹ کے ہمارے سینیئر اور ہم جونیئرز گئے ہوئے تھے وہاں پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹرزیڈ اے سلہری سے ملاقات ہوئی۔ لڑکے ایک دائرے کی شکل میں اُن کے آس پاس کھڑے تھے۔ انہوں نے اچانک سوال کیا:

Why are you doing Journalism to become PRO?,

میں نے فوراً کہا:

Sir we are doing Journalism to become Z.A. Sulehri

اس پر انہوں نے میری طرف دیکھا اور مسکرائے۔ اس کے بعد تھوڑی دیر اُن کے ساتھ ہوٹل کی لابی میں بیٹھا رہا۔ انہوں نے مجھے کیولری گراؤنڈ میں واقع اپنے گھر کا فون نمبر اور ایڈریس بھی دیا کہ کبھی آیئے گا۔ میں نے ایک دفعہ فون کیا کہنے لگے آج اسلام آباد کے لئے نکل رہا ہوں دو چار دن میں واپس آ جاؤں گا پھر آپ ضرور تشریف لایئے گا۔ اُن کا تعلق موضع دیولی تحصیل شکر گڑھ (ضلع سیالکوٹ اب نارووال سے تھا۔) میجر

طیب اعجاز قریشی، الطاف حسن قریشی کے ہمراہ

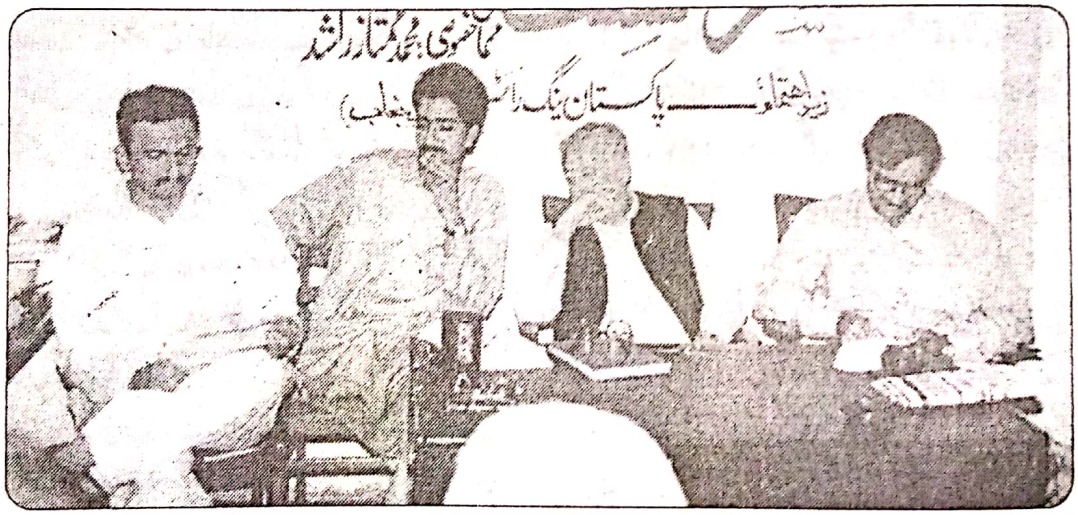

1991ء میں ایک ادبی تقریب میں معروف دانشور شہزاد احمد، ممتاز راشد اور نوید مرزا کے ساتھ

جنرل (ریٹائرڈ) اے جی ممتاز جو میری نانی اور دادی دونوں کے فرسٹ کزن تھے نے راولپنڈی میں ملاقات کے دوران مجھے بتایا کہ زیڈ اے سلہری میری (جنرل صاحب) والدہ کی طرف سے ہماری برادری ہی کے تھے۔ پھر خود ہی بتانے لگے زیڈ اے سلہری نے بہت شفاف صحافت کی ہے۔ میں نے کسی جگہ اُن کی بیٹی کا مضمون پڑھا جو انہوں نے اپنے والد زیڈ اے سلہری کے حوالے سے لکھا تھا کہ

Scanned with CamScanner

جب میری شادی تھی تو والدہ نے اُن سے پیسوں کا تقاضا کیا کہ اتنے خرچے ہیں، کیا ہوگا؟۔ اس پر انہوں نے کہا بس جو ہمارے پاس ہے اُسی کے اندر رہتے ہوئے فرض کی ادائیگی کرو۔ پیسے کی فراوانی بیٹیوں کے اچھے مستقبل کی ضمانت نہیں ہوا کرتی۔ زیڈ اے سلہری مرحوم جیسے صحافی جنہوں نے صحافت کو مشن سمجھ کر کیا ہو ہمیشہ ہانٹ کرتے ہیں۔

سوشل میڈیا آج سب سے زیادہ ڈسکس کیا جاتا ہے۔ میری اس کے متعلق رائے یہ ہے کہ سوشل میڈیا ایک پاور ہے۔ پہلے صرف پرنٹ میڈیا تھا۔ الیکٹرانک میڈیا کی مشروم گروتھ ہوئی تو یوں محسوس ہوا جیسے انفارمیشن کا ایک طوفان بپا ہوگیا ہے۔ بریکنگ نیوز کا کلچر چل نکلا۔ خبر ٹھیک نکل آئے تو اچھی بات۔ دوسری صورت میں چپکے سے بریکنگ نیوز کا ٹکر غائب کر دیا جاتا ہے۔ لیکن سوشل میڈیا جب سے آیا ہے اور جس طرح سے ہمارے ہاں سوشل میڈیا کا استعمال کیا جارہا ہے اُس سے لگتا ہے ہمارا معاشرہ سوشل میڈیا کے اس فلڈ کے لئے تیار نہیں تھا۔ سوشل میڈیا پر ایک افراتفری اور آپا دھاپی دکھائی دیتی ہے۔ کوئی کسی کی نہیں سن رہا۔ ہر کوئی اپنی دہائی دیئے جارہا ہے۔ جس طرح سے ہمارے معاشرے کی سیاسی و سماجی روایات تبدیل ہوئی ہیں سوشل میڈیا بھی اُس کا عکاس دکھائی دیتا ہے سیاست میں رواداری، اعتدال اور برداشت کا عنصر موجود تھا۔ اب کچھ عرصے سے ایک دوسرے کی تذلیل اور تحقیر کا کلچر آ گیا ہے بلکہ باقاعدہ پنپ گیا ہے اس کے اثرات جہاں زندگی کے دیگر پہلوؤں پر پڑے ہیں وہاں سوشل میڈیا بھی اس سے نہیں بچ سکا۔

میری شادی جنوری 1995ء میں ہوئی، میری وائف میری سیکنڈ کزن ہے۔ ان کی والدہ مرحومہ، میری مرحومہ والدہ اور والد صاحب (جو ماشاء اللہ بقیدِ حیات ہیں) کی خالہ کی بیٹی ہیں۔ میری مسز نے لاہور کالج فار ویمن سے ایم اے اسلامیات کیا تھا بعدازاں بی ایڈ کیا۔ وہ ایک تعلیمی ادارے سے وابستہ ہیں۔ میری دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ بڑی بیٹی اسلام آباد یونیورسٹی سے بی ایس انگریزی کر رہی ہے جبکہ چھوٹی بیٹی ایف ایس سی کے بعد ابھی ایم ڈی کیٹ اور داخلے کے دیگر امتحانات دے رہی ہے۔ بیٹے نے ابھی حال ہی میں میٹرک کیا ہے۔ شادی ظاہر ہے ایسا ایونٹ ہوتا ہے کہ دوستوں کو بلایا جانا دُلہن کی سائیڈ سے لوگوں کو بلانے سے بھی زیادہ ضروری سمجھا جاتا ہے۔ میں نے شادی کارڈ کے ساتھ سیالکوٹ سے گاؤں پہنچنے تک کے لئے نقشے کی ایک کاپی بھی لف کی ہوئی تھی اور اس میں بارش کی صورت میں متبادل راستے کا روٹ بھی دیا ہوا تھا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا میرے ولیمے پر واقعتاً بارش ہوگئی اور وہ بھی موسلا دھار بارش۔ لاہور سے میرے کلاس فیلو اویس باجوہ، جونیئر علی رضا اُسی بارش میں ''تلکن'' سے بچتے ہوئے پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ لائیو سٹاک ڈویلپمنٹ پراجیکٹ کے میرے دوستوں کا پروگرام بارش کی نذر ہوگیا، ڈاکٹر اقبال انجم بہرحال اپنے اہلِ خانہ سمیت ایک دن پہلے پہنچ گئے۔ ان کی فیملی اب ماشاء اللہ کینیڈا میں سیٹل ہے اور بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے بہترین جابز کر رہے ہیں۔ دوستوں کی مین کھیپ برادرم توفیق بٹ لے کر آئے، انہوں نے اور بھائی جان طارق فاروق نے لاہور سے باقاعدہ ایک کوسٹر کروائی۔ اُن کا سیالکوٹ تک تو سفر یقیناً اچھا رہا لیکن جیسے ہی وہ گاؤں والی سڑک کی طرف مُڑے اور پھر نہر کے کنارے کنارے کوسٹر مڑی اور تیز بارش کی وجہ سے دو تین

Scanned with CamScanner

مرتبہ کوسٹر پھسلی تو ڈرائیور کا صبر جواب دے گیا۔ اُس نے اُنہیں انتہائی مؤدبانہ گزارش کی کہ آپ اِدھر ہی اُتر جائیں میں آپ سے کرایہ بھی نہیں لیتا۔ اگر کوسٹر کو کچھ ہو گیا تو میں لاہور جا کر مالک کو کیا جواب دوں گا۔ بہرطور لاہور سے برادرم توفیق بٹ، بھائی جان طارق فاروق، بھابی نازلی طارق، وقاص طارق (اب روزنامہ جہانِ نو کے ایڈیٹر) آپا ریحانہ علیم مشہدی اور بہت سے دیگر دوست مجھے ان سب کو دیکھ کر دِلی مسرت ہوئی لیکن ظاہر ہے بارش کا ہونا نہ ہونا اور پھر کتنی ہونا اور کتنی نہ ہونا اس میں قدرت کا اختیار ہے۔ دوستوں کے لئے بہرطور گاؤں تک کا سفر ایک زحمت اور ایڈونچر بن گیا تھا۔ آج کل تو دیہاتوں میں ہر جگہ پکی سڑکیں بنی ہوئی ہیں زندگی آسان ہوگئی ہے۔ تب حالات مختلف تھے۔ یوں وہ دوست جو اچھے موسم میں گاؤں کی ہریالی، نہروں اور درختوں سے بھرپور ماحول دیکھ کر خوش ہوتے انہیں بارش کی صورت میں پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ گاؤں کی بعض بزرگ عورتوں نے مجھ پر یہ بھی ''الزام'' لگایا کہ بچپن میں جو بچے 'ہانڈی چاٹتے' ہیں اُن کی شادی پر بارش ہوتی ہے۔ حالانکہ میں اوائل عمری اور پھر یونیورسٹی تک زیادہ ہاسٹل ہی میں رہا، وہاں میس کے چاچے ''ہانڈی چاٹنے'' والی یہ سہولت میسر نہیں ہونے دیتے۔ ان سے تو دوسری مرتبہ ''گریوی'' لینی مشکل ہوجاتی ہے۔ ہانڈی یا پتیلے کے قریب وہ کہاں جانے دیتے ہیں۔ بہرکیف یہ زندگی کے مختلف رنگ ہیں جو بعض ایونٹس کو یادگار بنادیتے ہیں۔

آخر میں میری ایک غزل پیش خدمت ہے کہ

کیوں اتنی رکاوٹیں ہیں میرے اور اُس کے بیچ
بے وجہ عداوتیں ہیں میرے اور اُس کے بیچ

میرے اور اُس کے بیچ کہنے کو کچھ نہیں
چند ایک وضاحتیں ہیں میرے اور اس کے بیچ

راتوں کو ہوئی اس پہ اُٹھ اُٹھ کے شاعری
چند غزلی عبادتیں ہیں میرے اور اُس کے بیچ

کچھ اس سے زیادہ کا تو دعویٰ نہیں مجھے
بیتی رفاقتیں ہیں میرے اور اُس کے بیچ

گو ظاہراً تو آئی قیامت کوئی نہ پر
ہر دم قیامتیں ہیں میرے اور اُس کے بیچ

سوچیں الگ تھیں، پھر بھی اکٹھے چلے تھے یوسف
صدہا مسافتیں ہیں میرے اور اُس کے بیچ

میری اب دو کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ شخصی خاکوں پر مبنی کتاب خوش باشیاں 2008ء میں شائع ہوئی جبکہ پنجابی شاعری کی کتاب 'سُفنے' 2018ء میں شائع ہوئی۔ پانچ کتابوں کے مسودے تیار ہیں۔ ان میں طنز و مزاح پر مبنی مضامین کی کتاب بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ میری شدید خواہش ہے کہ میں ملازمت سے سبکدوشی کے بعد اپنی یادداشتیں قلمبند کروں۔

میں چیف ایڈیٹر قومی ڈائجسٹ جناب مجیب الرحمٰن شامی، ایڈیٹر خالد ہمایوں صاحب اور آپ کا بے حد شکرگزار ہوں کہ آپ نے میرا اس قدر ''طویل انٹرویو'' کر ڈالا۔ آپ گزشتہ ایک سال سے جس مستقل مزاجی کے ساتھ اس ''نیک کام'' کے لیے میرے پیچھے پڑے رہے، میں اس ہمت پر آپ کو داد دیتا ہوں۔ اگر آپ بار بار اصرار نہ کرتے تو یقین جانیے کہ میں کبھی اس انٹرویو کے لیے اتنا وقت نہ نکال پاتا۔ آپ سے ملاقات بھی نہایت خوشگوار رہی۔ میں ادارہ قومی ڈائجسٹ سے وابستہ آپ سب دوستوں کے لیے دعاگو ہوں۔

✠.....❖.....✠

Scanned with CamScanner

ممتاز ادیب، صحافی ڈاکٹر یوسف عالمگیرین ''قومی ڈائجسٹ''

کو دیئے گئے انٹرویو کے موقع پر عبدالستار اعوان کے ہمراہ

Scanned with CamScanner

MONTHLY QAUMI DIGEST LAHORE CPL NO 175

قرشی

جوہر جوشاندہ®

EXTRA STRENGTH

دُور رکھے...
زکام، کھانسی، نزلہ!

آپ بھی عادت بنالیں!

Dr. Uffaira Anis Saad
Nutritionist

www.qarshi.com JoharJoshandaOfficial www.qarshihealthshop.com

Scanned with CamScanner